کمانڈو ایکشن

اے حمید



کمانڈو ایکشن

پہلا حصہ

اے حمید

کمانڈو بوائے کہانی نمبر — ۱

کمانڈو ایکشن

اے حمید



فیروز سنز لمیٹڈ پرائیویٹ

لاہور - راولپنڈی - کراچی

فہرست

۵

پاکستان زندہ باد

نواب شاہ (سندھ)

۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ء

پیارے انکل اے حمید!

السّلام علیکم! اسلام و دعا کے بعد عرض ہے کہ جب میں اخبار میں پڑھتا ہوں کہ ملک دشمن لوگ میرے پیارے ملک پاکستان میں تخریب کاری کر رہے ہیں تو میرا دل وطن کی محبت کے جوش سے بھر جاتا ہے۔ پھر میں دل میں سوچتا ہوں کہ کیوں نہ میں کمانڈو بن کر ان ملک دشمن لوگوں کو ختم کر دوں۔

میں آپ کو اس لیے خط لکھ رہا ہوں انکل کہ پلیز کمانڈو فورس سے کہہ کر مجھے کمانڈو بنا دیں تاکہ میں پاکستان دشمنوں کے خلاف جنگ کروں، پاکستان کی خدمت کروں اور پاکستان میں سے دشمنوں کو ختم کر دوں۔ یہ دشمن باہر سے آ کر ہمارے ملک میں تخریب کاری کرتے ہیں۔ پلیز انکل! مجھے کمانڈو بنا دیں۔ میں کمانڈو بن کر ملک و قوم کے لیے اپنی جان قربان کرنا چاہتا ہوں۔

فقط

نصر اللہ خاں جماعت ہفتم سی

گورنمنٹ ہائی سکول پڈ عیدن (نواب شاہ) سندھ

پیارے دوستو!

جب مجھے وطنِ پاک کے پیارے صوبے سندھ کے محبِّ وطن طالب علم نصراللہ خاں کا یہ وطن کی محبّت میں ڈوبا ہوا خط ملا تو میرا دل بھی پاکستان کی محبت سے لبریز ہو گیا۔ کیونکہ ہم سب پاکستان سے محبت کرتے ہیں اور کبھی اسے نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتے۔

اسی وقت میرے دل میں ایک بہادر، محبِّ وطن اور دلیر کمانڈو بوائے علی کا تصوّر اُبھر آیا اور یوں میں نے آپ دوستوں کے لیے کمانڈو بوائے کی وطن کی محبت میں ڈوبی ہوئی ایڈونچرس، حیرت انگیز اور سنسنی خیز داستان لکھنی شروع کر دی۔ کمانڈو بوائے علی کا دل بھی پاکستان کی محبت میں سرشار ہے اور وہ بھی نصراللہ خاں کی طرح اپنے وطن کو دشمنوں کی تخریب کاریوں سے پاک کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر دشمن کی صفوں میں گھس گیا ہے۔ اس کی پیاری بہن رُوبی بھی اس کے ساتھ ہے۔ دونوں بہن بھائی کیسے دشمن ملک میں پہنچتے ہیں اور پھر وہاں کمانڈو ایکشن سے کیسے کیسے حیرت ناک کارنامے کرتے ہیں۔ یہ آپ کو ان کی دلیرانہ اور سنسنی خیز داستان پڑھ کر ہی معلوم ہوگا۔

تمہارا انکل!

اے حمید

اے حمید ۴۵ ۴۔ این راہِ چمن سمن آباد لاہور

اکتوبر ۱۹۸۸

موت کا خط

گھپ اندھیری رات میں ایک جیپ کھیتوں کے پاس آکر رک گئی۔ جیپ میں سے دو آدمی باہر نکلے اور جلدی سے کھیتوں کے اندھیرے میں گھس گئے۔ ان میں سے ایک سکھ تھا اور دوسرا ہندو۔ سکھ کا نام گنڈا سنگھ تھا اور ہندو کا نام ٹیکم داس تھا۔ دونوں نے اپنے چہرے کالی چادروں میں چھپائے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس گولیوں سے بھری ہوئی تھری ناٹ تھری کی رائفلیں تھیں۔ وہ خاموشی سے رات کے اندھیرے میں کھیتوں میں چھپ کر آگے بڑھتے گئے۔ جب سامنے ایک کوٹھی کی دیوار نظر آئی تو گنڈا سنگھ نے اپنے ساتھی ٹیکم داس سے سرگوشی میں کہا۔

"ٹیکم! ہوشیار رہنا۔ جس آدمی کو ہم قتل کرنے جا رہے ہیں وہ پاکستانی فوج میں کمانڈو رہ چکا ہے اور

پاکستانی کمانڈو کا مقابلہ کرنا اِتنا آسان نہیں"۔
ہندو ملسیکم داس نے آہستہ سے کہا۔
"گنڈا سنگھ! تم بے فکر رہو۔ میں تو تمہارے پیچھے رہوں گا۔ تم اس سے بات کرو گے۔ اگر وہ نہ مانا تو میں چھُپ کر اس پر گولی چلا دوں گا"۔
گنڈا سنگھ نے آہستہ سے کہا۔
"یاد رکھنا۔ بالکل ٹھیک کمانڈو بہادر شاہ کے سینے کا نِشانہ لے کر فائر کرنا۔ آج اس کا بیٹا علی بھی گھر پر نہیں ہے۔ اگر علی ہوتا تو بڑی مشکل پڑ جاتی کیونکہ ریٹائرڈ کیپٹن بہادر شاہ نے اپنے نوجوان بیٹے علی کو بھی کمانڈو کو پوری پوری ٹریننگ دے رکھی ہے"۔
ٹیکم داس دھیمی سرگوشی میں بولا۔
"اور بہادر شاہ کی ایک نوجوان لڑکی رُومی بھی تو ہے"۔
گنڈا سنگھ نے کہا۔
"ہاں! ہم اُسے قتل نہیں کریں گے بلکہ اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اَب تم ایسا کرو کہ دیوار کے ساتھ جو کھمبا لگا ہے اُس پر چڑھ کر کوٹھی کے ٹیلی فون کا تار کاٹ ڈالو تاکہ وہاں سے کوئی پولیس کو

ٹیلی فون نہ کر سکے۔"

ہندو ٹیکم داس رات کے گھپ اندھیرے میں کوٹھی کی دیوار کی طرف بڑھا۔ یہ لوگ سارا سامان ساتھ لے کر انڈیا کی سرحد پار کر کے غیر قانونی طور پر پاکستان کے بارڈر میں داخل ہوئے تھے۔

رات اتنی اندھیری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہ آتا تھا۔ ہندو ٹیکم داس ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ گیا۔ اُس نے جیب سے قینچی نکال کر ریٹائرڈ کمانڈر بہادر شاہ کی کوٹھی میں جاتے والے ٹیلی فون کا تار کاٹ دیا۔ اب گنڈا سنگھ بھی اپنے ساتھی کے پاس آگیا۔ وہ دونوں اندھیرے میں کوٹھی کے گیٹ کی طرف بڑھے جو بند تھا۔ اچانک اندر سے کمانڈر بہادر شاہ کا کُتا غُرایا۔ گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس وہیں بیٹھ گئے۔ گنڈا سنگھ نے دھیمی آواز میں کہا:

"کُتے کو چاروں سینگ پھینک دو!"

ہندو ٹیکم داس نے جیب میں سے چار سینگ نکالے اور گیٹ کے اوپر سے کوٹھی کے اندر پھینک دیئے۔ یہ چاروں بھینس کے سینگ تھے۔ یہ اندر سے کھوکھلے تھے اور ان میں گائے کے گوشت کا قیمہ اِس طرح سے

بھرا ہوا تھا کہ کتا اُسے نکال نہیں سکتا تھا اور چھوڑ بھی نہ سکتا تھا۔ اِس طرح سے کتے کی ساری توجّہ قیمہ بھرے سینگ کی طرف لگ جاتی اور یہ دونوں قاتل سمگلر اپنا کام سکون سے کر سکتے تھے۔

گوشت کی بُو پاکر کمانڈو ریٹائرڈ کیپٹن بہادر شاہ کا کتا بھینس کے سینگوں کی طرف لپکا۔ وہ سینگوں میں سے قیمہ نکالنے کی کوشش میں لگ گیا۔ کتے کو مصروف پاکر وہ ہندو اور سکھ قاتل دیوار پھاند کر کوٹھی کے اندر داخل ہو گئے۔

یہ چھوٹی سی کوٹھی درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے ڈرائنگ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں ریٹائرڈ کمانڈو کیپٹن بہادر شاہ اپنی نوجوان لڑکی روبی کے پاس بیٹھا اسے بزرگانِ دین کی ایک کتاب پڑھ کر سنا رہا تھا۔ روبی کی عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔

نومبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ رات کو ٹھنڈ ہوتی تھی۔ روبی کے بال سنہری تھے۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ رنگ گورا اور سُرخ تھا۔ اس کے باپ بہادر کی عمر پچاس کے اوپر تھی۔ سر کے بال کنپٹیوں پر سفید ہو رہے تھے۔ مگر چونکہ وہ پاکستانی فوج میں کمانڈو رہ

چکا تھا اِس لیے اب بھی اس کا جسم بڑا مضبوط تھا۔ وہ آتش دان کے پاس گھٹنوں پر کمبل ڈالے کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ روبی اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ باپ نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

"رُوبی بیٹی! اب رات زیادہ ہو گئی ہے۔ تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ میں تمہارے بڑے بھائی علی کا اِنتظار کروں گا"۔

رُوبی نے کہا۔

"ڈیڈی! علی بھائی ابھی تک آیا کیوں نہیں۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ اِسے اَب تک آجانا چاہیے تھا لاہور سے!"

باپ کہنے لگا۔

"لاہور کون سا یہاں سے دُور ہے بیٹی! گاڑی لے کر گیا ہے۔ بس آتا ہی ہوگا"۔

رُوبی نے کہا۔

"ڈیڈی! آپ لاہور آنٹی کو فون کر کے پُوچھیں کہ علی بھائی وہاں سے چل پڑا ہے کہ نہیں"۔

باپ نے تپائی پر رکھے ہوئے فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کئی بار فون کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ شاید اُن کا فون خراب ہے۔ گھنٹی بجتی ہے، کوئی اُٹھاتا ہی نہیں"۔

"پلیز! ایک بار پھر کوشش کریں ڈیڈی! مجھے علی بھائی کی بڑی فکر لگی ہے"۔

"ایسی کوئی بات نہیں بیٹی رُوبی! علی اگرچہ ابھی بیس برس کا ہے مگر وہ بڑا بہادر لڑکا ہے۔ اور پھر مَیں نے اِسے کمانڈو کی پوری ٹریننگ دے رکھی ہے"۔

رُوبی کے ڈیڈی نے ریسیور اٹھا کر ڈائل گھمایا۔ ریسیور کان سے لگاتے ہی بولا۔

"یہ لو۔ اب ہمارا فون بھی ڈیڈ ہو گیا ہے"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈیڈی! لائیے میں فون کرتی ہوں"۔

یہ کہہ کر روبی نے خود نمبر گھمایا۔ ریسیور کان سے لگایا تو بولی۔

"واقعی ڈیڈی ہمارا ٹیلی فون بھی خراب ہو گیا ہے۔ بالکل آواز نہیں آ رہی"۔

اُنہیں کیا معلوم تھا کہ اُن کا ٹیلی فون کوٹھی کے باہر چھُپے ہوئے قاتل سمگلروں گنڈا سنگھ اور ہندو ٹیکم نے کاٹ دیا ہوا ہے۔ رُوبی کے ڈیڈی نے اپنی بیٹی

کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔
"گھبراؤ نہیں رُوبی بیٹی! علی بس آنے ہی والا ہوگا"
رُوبی نے اُداس آواز میں کہا۔
"ڈیڈی! علی میرا ایک ہی تو بھائی ہے۔ اسے ذرا دیر ہو جاتی ہے تو مجھے فکر لگ جاتی ہے اور پھر ہم شہر لاہور سے دُور انڈیا کی سرحد کے پاس رہتے ہیں"۔
ڈیڈی نے اٹھ کر رُوبی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔
"پھر کیا ہوا بیٹی! بارڈر ہمارے پاکستان کا ہے اور ہم بہادر پاکستانی ہیں اور پھر میں نے تم دونوں کو ایک سچے اور بہادر پاکستانی بننے کی تربیت دی ہے"۔
ڈیڈی نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا۔
"تم دونوں ہی تو میری زندگی کا سہارا ہو۔ تم چھوٹے سے تھے جب تمہاری والدہ ہمیں چھوڑ کر اللہ میاں کے پاس چلی گئیں۔ تب سے میں نے تم دونوں کو باپ کے ساتھ ساتھ ماں بن کر بھی پالا ہے۔ تمہیں پڑھایا لکھایا علی کو زرعی یونیورسٹی سے گریجوایٹ کرایا۔ پھر میں نے فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد یہاں بارڈر پر زمین خرید کر اپنا فارم بنایا۔ اپنی یہ کوٹھی بنائی۔ میرے بیٹے اور تمہارے بھائی علی نے میرا ہاتھ بٹایا اور اب وہ فارم

کے باغوں کا سارا انتظام خود ہی کرتا ہے۔ بس اب اللہ سے یہی دعا کرتا ہوں کہ تم اپنے گھر آباد ہو جاؤ تو میں حج کرنے کے لیے جاؤں۔"

روبی نے شرماتے ہوئے کہا۔

"نہیں ڈیڈی! میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

ڈیڈی نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور کہا۔

"روبی بیٹی! لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو انہیں ماں باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے نئے گھر جانا ہی پڑتا ہے۔"

روبی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈیڈی نے اُسے پیار کیا اور کہا۔

"اچھا، اب تم اُوپر اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ مَیں تمہارے بھائی علی کا انتظار کروں گا۔"

رُوبی شب بخیر کہہ کر زینہ چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے دوسری منزل والے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور سونے کی تیاری کرنے لگی۔ اُس کے ڈیڈی نے کتاب بند کر کے میز پر رکھی۔ کاپی اور بال پوائنٹ لیا

اور کاپی پر باغ کے پھلوں کا حساب لکھنے لگے کہ آج دن میں فارم کے باغ میں سے پھلوں کے کتنے ٹوکرے منڈی بھیجے گئے تھے۔ اِسے اپنے پیارے بیٹے علی کی طرف سے پریشانی ضرور تھی کہ ابھی تک وہ واپس کیوں نہیں پہنچا۔ کاپی پنسل میز پر رکھ کر ڈیڈی نے دوبارہ لاہور فون کرنا چاہا مگر فون ڈیڈ تھا۔

اُس نے مایوسی کے ساتھ ریسیور فون پر رکھ دیا۔ وہ کرسی سے اُٹھنے ہی لگا تھا کہ اچانک کھڑکی زور سے کھلی اور گنڈا سنگھ رائفل تان کر اندر آیا اور اس نے آتے ہی رائفل کی نالی رُوبی اور علی کے ڈیڈی کے سینے کے ساتھ لگا دی اور آہستہ سے کہا۔

"بہادر شاہ! اگر ذرا بھی شور مچانے یا اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی تو تھری ناٹ تھری کی گولی تیرا سینہ پھاڑ کر نکل جائے گی۔"

رُوبی کا ڈیڈی گنڈا سنگھ کو جانتا تھا۔ وہ بارڈر کے ہندوستان والے علاقے کا بدنام سمگلر اور خُونی تھا۔ وہ کئی بار رُوبی اور علی کے ڈیڈی کو مجبور کر چکا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ مل کر سمگلنگ کرے اور اُن کا راستہ نہ روکے۔ مگر رُوبی کے ڈیڈی نے ہمیشہ انکار کیا تھا اور

کہا تھا کہ میں ایک سچا پاکستانی ہوں۔ میں سمگلنگ نہیں کروں گا بلکہ روبی کے ڈیڈی نے گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس سمگلروں کو خبردار کر دیا تھا کہ اگر وہ اب اس کی کوٹھی میں آئے تو وہ انہیں پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے گا۔

گنڈا سنگھ انڈیا سے الائچی اور گرم مسالے پاکستان سمگل کر کے یہاں سے ہیروئن لے جاتا تھا اور لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیہ کماتا تھا۔ لیکن رُوبی اور علی کے ڈیڈی نے ان کا راستہ روک دیا تھا۔ ان ہندو سِکھ سمگلروں کو کروڑوں روپے کا نقصان ہو رہا تھا۔ چنانچہ آج وہ رُوبی کے ڈیڈی سے آخری بار بات کرنے آئے تھے۔

رُوبی کے ڈیڈی کمانڈو بہادر شاہ نے گنڈا سنگھ کو پہچان لیا تھا۔ گنڈا سنگھ نے مُنہ پر سے کپڑا ہٹایا اور بولا۔

"بہادر شاہ! مَیں آخری بار تم سے سَودا کرنے آیا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ مل جاؤ تو میں تمہیں ہر مہینے دو لاکھ روپے ادا کر دیا کروں گا۔"

رُوبی کے ڈیڈی نے کہا۔

"گنڈا سنگھ! مَیں مسلمان ہوں۔ کمانڈو ہوں اور سچا

پاکستانی ہوں۔ اگر تم مجھے ایک کروڑ روپیہ بھی دے دو تب بھی میں اپنے وطن کو نقصان پہنچانے پر تیار نہیں ہوں۔"

گنڈا سنگھ نے رائفل کی نالی رُوبی کے ڈیڈی کے سینے سے لگا رکھی تھی۔ بہادر شاہ اگرچہ ایک تجربہ کار بہادر کمانڈو رہ چکا تھا مگر جب رائفل کی نالی سینے کے ساتھ لگی ہو تو بڑی مشکل بن جاتی ہے۔

گنڈا سنگھ نے رائفل کی نالی چبھوتے ہوئے کہا۔

"بہادر شاہ! میں تمہیں آخری بار کہتا ہوں ہمارے ساتھ مل جاؤ۔ اگر نہیں مل سکتے تو ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں تمہیں مالا مال کر دوں گا۔"

کمانڈو بہادر شاہ نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔

"میں موت کو گلے لگا لوں گا مگر اپنے وطن پاکستان پر آنچ نہ آنے دوں گا۔"

اِس دوران رُوبی اور علی کے ڈیڈی بہادر شاہ نے ایک خاص کمانڈو وار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جونہی گنڈا سنگھ نے رائفل کو ذرا آگے کیا، کمانڈو بہادر شاہ نے نیچے سے ٹانگ گنڈا سنگھ کے پیٹ پر ماری۔ گنڈا سنگھ کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی

اور وہ نیچے کو گرا۔ مگر گنڈا سنگھ کا ہندو سمگلر ساتھی ٹیکم داس کھڑکی کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ جونہی اُس نے گنڈا سنگھ کو گرتے دیکھا، اس نے رائفل کا نشانہ لے کر روبی کے باپ کمانڈو بہادر شاہ پر گولی چلادی۔
ایک بھیانک دھماکہ ہوا۔ گولی سیدھی روبی کے ڈیڈی کے پیٹ میں لگی اور پیچھے سے کمر کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ رُوبی کا ڈیڈی کرسی پر سے نیچے گر پڑا اور اُس کے پیٹ سے خون کا فوارہ اچھل پڑا۔

فائر کا دھماکا سُن کر اوپر سے رُوبی بھاگتی ہوئی نیچے آئی۔ اپنے ڈیڈی کو آتشدان کے پاس خون میں لت پت دیکھ کر اُس کی چیخ نکل گئی۔

"ڈیڈی!"

رُوبی اپنے باپ کی طرف بڑھی تو گنڈا سنگھ نے چلا کر ٹیکم داس سے کہا۔

"اوئے اس کا مُنہ بند کرو ٹیکم!"

ہندو سمگلر ٹیکم داس کھڑکی میں سے کُود کر اندر آگیا۔ رُوبی چیخ رہی تھی۔ چلّا رہی تھی۔ دونوں سمگلروں گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس نے مل کر روبی کو پکڑ لیا۔ اس کا مُنہ کپڑے سے باندھا اور اُسے اُٹھا کر کھڑکی سے

باہر کود گئے۔ رُوبی کا مُنہ بند تھا۔ اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ مگر وہ ہاتھ پاؤں مار کر اپنے ڈیڈی کے قاتلوں کے پنجے سے نکل جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ایک سولہ سترہ سال کی نازک لڑکی بھلا دو ہٹے کٹے سمگلروں کا مقابلہ کیسے کر سکتی تھی۔

گنڈا سنگھ نے رُوبی کو کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ وہ کھیتوں میں سے دوڑتے ہوئے جیپ کی طرف بڑھے۔ اتنے میں کوٹھی میں سے بہادر شاہ کا کُتا نکل کر بھونکتا ہوا اُن کی طرف لپکا۔ ہندو سمگلر ٹیکم داس نے اندھیرے میں کُتے کا نشانہ لے کر دو فائر کر دیئے۔ ایک گولی کُتے کی گردن میں لگی اور کُتا وہیں ڈھیر ہو گیا۔

دونوں سمگلروں نے رُوبی کو جیپ میں ڈالا اور رات کے اندھیرے میں جیپ کو بھگاتے ہوئے خُفیہ راستے سے پاکستان کی سرحد سے نکل کر ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گئے۔

اس کے بعد وہاں موت ایسی خاموشی چھا گئی۔ رُوبی کے ڈیڈی کو گولی پیٹ میں لگی تھی۔ خون کافی بہہ چکا تھا۔ ڈیڈی کو معلوم تھا کہ تھری ناٹ تھری کی گولی پیٹ میں لگ جائے تو بچنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کی

پیٹھ پر دس انچ بڑا سوراخ بن گیا تھا۔ اس پر موت کی کمزوری چھانے لگی اور سانس اکھڑنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر تپائی پر سے کاپی اور بال پوائنٹ نیچے گرا لیا تھا۔ پھر کپکپاتے ہاتھوں سے کاپی پر آہستہ آہستہ لکھنے لگا:

"علی بیٹے! مجھے سمگلر گنڈا سنگھ اور اس کے ساتھی ٹیکم داس نے ہلاک کیا ہے۔ کیونکہ میں نے اپنے وطن کی عزت کا سودا نہیں کیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ دونوں سمگلر پہلے بھی مجھے دھمکیاں دیتے رہے ہیں۔ میں مر رہا ہوں۔ مجھے موت کا غم نہیں۔ غم اس بات کا ہے کہ دونوں سمگلر تیری معصوم بہن اور میری پیاری بیٹی روبی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔

میرے بیٹے علی! جب تک تم اپنی بہن کو واپس نہیں لاؤ گے اور ان کافروں سے میرے قتل کا بدلہ نہیں لو گے، میری روح کو چین نصیب نہیں ہو گا۔ میں نے تمہیں کمانڈو کی ٹریننگ اسی دن کے لیے دی تھی۔ شاید ——— علی! تم آج سے پاکستان کے جانباز کمانڈو بن گئے ہو۔ جاؤ، پاکستان کے دشمنوں سے اپنی بہن کو چھڑا لاؤ اور ان سے میرے قتل کا بدلہ لو۔

تمہارے مرتے ہوئے باپ کی یہ تم سے آخری درخواست ہے۔

تمہارا ڈیڈی

بہادر شاہ ......"

اِس کے بعد رُوبی اور علی کے ڈیڈی کے ہاتھ سے بال پوائنٹ نیچے گر پڑا۔ وہ شہید ہو چکا تھا۔ ڈرائنگ روم میں بتیاں جل رہی تھیں۔ آتش دان کے پاس شہید کمانڈو بہادر شاہ کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔ اُس کے قریب ہی کاپی پر شہید کمانڈو کا اپنے کمانڈو بیٹے کے نام آخری پیغام لکھا ہوا تھا۔ کوٹھی سے باہر گیٹ سے چند قدموں کے فاصلے پر اُن کے پالتو کتے کی لاش پڑی تھی۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے بھی اس منظر کو دیکھ کر اُداس ہو گئے تھے۔

اتنے میں دُور جی ٹی روڈ پر سے کوٹھی کی طرف آنے والی کچی سڑک پر کار کی روشنی دکھائی دی۔ شہید کمانڈو بہادر شاہ کا بیٹا اور رُوبی کا بھائی اُنیس سالہ نوجوان علی لاہور سے واپس آگیا تھا۔ وہ اپنی شیراڈ کار خود چلا رہا تھا۔ گاڑی میں کیسٹ پلیئر پر دل دل پاکستان کا

تیز ترانہ بج رہا تھا۔ علی نے نیلی جیکٹ اور نیلی جینز پہن رکھی تھی۔ اُس نے دُور سے فارم کے درختوں کے درمیان اپنی کوٹھی میں جلتی روشنی دیکھی تو بڑا خوش ہوا کہ اُس کے ڈیڈی اور بہن رُوبی اس کے اِنتظار میں رات بارہ بجے بھی جاگ رہے ہیں۔ وہ اپنی پیاری بہن روبی کے لیے شیزان سے ایک چاکلیٹ کیک اور لبرٹی سے ایک انگریزی کا فیشن میگزین لایا تھا۔ کیونکہ روبی کو نئے نئے ڈیزائن کے کپڑے سِلوانے کا بڑا شوق تھا۔

کوٹھی کے قریب پہنچ کر اس نے کار کا دو بار ہارن دیا تاکہ اس کے ڈیڈی اور بہن رُوبی کو اُس کے آنے کی خوش خبری پہلے ہی سے مل جائے۔

گاڑی کی روشنی کوٹھی کے بند گیٹ پر پڑی تو علی نے دیکھا کہ اُن کا پالتو کتا گیٹ سے باہر زمین پر پڑا ہے۔ وہ کچھ حیران سا ہوا کہ کُتے نے اُسے آتا دیکھ کر آواز کیوں نہیں نکالی۔ علی گاڑی بند کر کے کُتے کے پاس گیا تو اُسے خون میں لت پت مرا ہوا دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ اُس نے کوٹھی کے ڈرائنگ روم سے آتی روشنی کی طرف دیکھا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھُلی تھی۔ اُس نے جلدی سے گاڑی کی بتیاں بند کیں اور

گیٹ کھول کر ڈرائنگ روم کی طرف دوڑا۔

علی کا دل کسی نامعلوم خوف سے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جونہی وہ دروازہ کھول کر ڈرائنگ میں داخل ہوا، تو اپنے ڈیڈی کو آتشدان کے پاس گرے ہوئے پایا۔ وہ دوڑ کر اپنے باپ کو اٹھانے کے لیے بڑھا تو دیکھا کہ اُس کے باپ کی لاش خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ چیخ مار کر اپنے باپ کی لاش سے لپٹ گیا۔ اُس نے زور سے رُوبی کو پکارا۔

"رُوبی! رُوبی! رُوبی!"

وہ اپنی پیاری بہن کو پکارتا اس کے کمرے کی طرف جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آیا تو دیکھا کہ رُوبی کا کمرہ کھُلا پڑا ہے۔ اس کا پلنگ خالی ہے۔ کتابیں میز پر سے نیچے گری ہوئی ہیں اور روبی غائب ہے۔ وہ چلایا۔

"رُوبی! رُوبی بہن! تم کہاں ہو؟"

باتھ روم بھی خالی تھا۔ علی بوکھلایا ہوا نیچے باپ کی لاش کے پاس آکر بیٹھ گیا اور باپ کا مُردہ سر اپنی گود میں لے کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بند ہوگئی۔

"ڈیڈی! یہ کیا ہوگیا! آپ کو کس نے ہلاک کر دیا؟"

ڈیڈی! یہ کیا ہوگیا! ڈیڈی! ڈیڈی!"

علی زار و قطار رو رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اُس کے باپ کی خون میں ڈوبی لاش اُس کے سامنے پڑی ہے۔ اچانک روتے روتے اس کی نظر بتّی کی روشنی میں پاس ہی گری ہوئی کاپی پر پڑ گئی۔ کاپی کھلی تھی اور اس پر خون کے دھبّے پڑے ہوئے تھے۔ علی نے جلدی سے کاپی اٹھائی، دیکھا کہ اس پر اُردو میں ایک تحریر لکھی تھی۔ وہ روتے روتے اپنے ڈیڈی کی تحریر پڑھنے لگا۔

اپنے شہید باپ کی تحریر پڑھ کر جب اُسے معلوم ہوا کہ سکھ اور ہندو سمگلر گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس اُس کے باپ کو ہلاک کر کے رُوبی کو اٹھا کر لے گئے ہیں تو اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے کاغذ پھاڑ کر اپنی جیب میں رکھا اور جلدی سے پولیس کو فون کرنے کے لیے ٹیلی فون کا ڈائل گھمایا۔ بہت جلد اسے معلوم ہوگیا کہ ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے گئے ہیں۔ علی نے ٹیلی فون کا ریسیور وہیں پھینکا، بھاگ کر اپنے کمرے میں گیا اور الماری سے اپنا لائسنس یافتہ ریوالور نکالا۔ اُس میں گولیاں بھریں اور دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ پھر گاڑی کو تیزی سے

نکال کر کچی سڑک پر آگیا۔ اس نے جگہ جگہ دیکھا، اُسے قاتلوں اور بہن کے اغوا کرنے والے قاتلوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اُس کا خون کھول رہا تھا۔ غم سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ وہیں سے اس نے گاڑی قریبی شہر کی طرف ڈال دی۔ وہ رات کے اندھیرے میں ویران کچی سڑک پر سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی کو بھگائے لیے جا رہا تھا۔

جی ٹی روڈ پر آکر وہ سیدھا پولیس اسٹیشن آگیا۔ یہاں اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں تھانے دار کو بتایا کہ ہندو سکھ سمگلروں نے اس کے ڈیڈی کو قتل کر دیا ہے اور اس کی بہن کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ تھانے دار نے علی کو اطمینان سے بٹھایا۔ پھر پوچھا۔

"بیٹا! تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تمہارے ڈیڈی کو کافر سمگلروں نے ہلاک کیا ہے؟"

تب علی نے بوجھل ہاتھ سے جیب میں سے اپنے ڈیڈی کا لکھا ہوا خون آلود خط نکال کر تھانے دار کے حوالے کر دیا۔ تھانیدار نے خط پڑھتے ہی فوراً پولیس کی گارد ساتھ لی اور علی کو ساتھ لے کر کوٹھی پر پہنچ گیا۔ اُس نے پولیس کو سارے علاقے کی ناکہ بندی کرنے

اور جہاں بین کا حکم دیا اور خود علی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گیا جہاں علی کے ڈیڈی کی لاش پڑی تھی۔ تھانیدار نے لاش کا معائنہ کیا۔ ڈرائنگ روم قاتلوں کے پیروں کے نشان لیے اور علی سے کہا۔

"بیٹا! گھبراؤ نہیں! ہم تمہارے باپ کے قاتلوں کو گرفتار کر کے تمہاری بہن کو اُن سے بہت جلد برآمد کروا لیں گے۔ صرف تمہیں تھوڑا صبر کرنا ہوگا۔"

مگر علی کیسے صبر کر سکتا تھا۔ اُسے کیسے صبر آسکتا تھا۔ اُس کے پیارے ڈیڈی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ کافر اُس کی پیاری بہن کو اُٹھا کر لے گئے تھے اور تھانے دار اُسے صبر کرنے کو کہہ رہا تھا۔ علی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

پولیس کے سپاہی اندر آ گئے۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"جناب! ہم نے پورے علاقے کی ناکہ بندی کر دی ہے۔ قاتلوں کو جگہ جگہ تلاش کیا جا رہا ہے۔ صبح تک وہ ضرور پکڑے جائیں گے اور لڑکی بھی اُن سے برآمد کر لی جائے گی۔"

تھانے دار نے لاش اپنی تحویل میں لے لی۔ پولیس لاش لے کر اور علی کا بیان قلمبند کر کے چلی گئی۔ علی نے

گاڑی میں سے اپنی بہن کے لیے لایا ہوا کیک اور فیشن میگزین نکالا تو اُس کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ وہ گاڑی میں ہی اپنا سر سٹیئرنگ پر رکھے دیر تک اپنی پیاری بہن اور ڈیڈی کو یاد کر کے روتا رہا۔ جب رونے سے غم ذرا ہلکا ہوا تو وہ اپنی بہن کے کمرے میں آ گیا۔ اُس نے کیک کا ڈبہ اور میگزین کا لفافہ اپنی پیاری بہن رُوبی کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"رُوبی! مَیں یہ تیرے لیے لایا ہوں!"

اِس کے ساتھ ہی علی ایک بار پھر ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ وہ رُوبی کے بستر پر گر پڑا اور اپنا مُنہ اُس کے سرہانے میں چُھپا کر دیر تک روتا رہا۔ اسی طرح روتے روتے ساری رات گزر گئی۔

دوسرے دن فارم پر کام کرنے والے مزدور قریبی گاؤں سے آ گئے۔ جب انہیں اس افسوس ناک واقعے کی خبر ہوئی تو وہ بھی غم سے نڈھال ہو کر وہیں کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھ گئے۔ علی کمرے سے باہر نکلا۔ رات بھر رو رو کر اُس کی آنکھیں سُوج گئی تھیں۔ اس نے مزدوروں سے کہا۔

"آپ لوگ یہیں رہیں۔ میں لاہور فون کرنے جا

رہا ہوں۔"

علی نے گاڑی نکالی اور سیدھا پولیس اسٹیشن آگیا۔ یہاں اُس نے لاہور اپنی آنٹی کو فون کیا۔ آنٹی کے گھر میں اس خبر سے کہرام مچ گیا۔ وہ لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ تھوڑی ہی دیر بعد پہنچ گئے۔ ہر کوئی علی کو اپنے ساتھ لگا کر رونے لگا۔ نو بجے کے قریب ڈیڈی کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد کوٹھی پر پہنچا دی گئی۔

لاش کو دیکھ کر سب کی چیخیں نکل گئیں۔ اِسی روز علی کے ڈیڈی کو کوٹھی کے پیچھے لان میں دفن کر دیا گیا۔ شام تک لاہور سے آئے ہوئے سارے رشتہ دار بھی چلے گئے۔

علی سخت بے چین تھا۔ اُسے اپنے پیارے ڈیڈی کی موت کا ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔ اُس کے ڈیڈی نے علی کو کمانڈو کی پوری پوری ٹریننگ دے رکھی تھی۔ علی کو سب سے زیادہ غم اپنی پیاری بہن رُوبی کا تھا۔ جب وہ سوچتا کہ کافر اُسے اٹھا کر لے گئے ہیں اور خدا جانے وہ کس حالت میں ہوگی تو اُس کا خون کھول اُٹھتا۔

سُورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کے اندھیرے آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔ کوٹھی ویران تھی۔ سب رشتہ دار واپس لاہور جا چکے تھے۔ صرف علی کا جگری دوست عباس اس کے پاس تھا۔ علی نے عباس سے کہا۔

"عباس! پولیس کی کارروائی لمبی ہو سکتی ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ پولیس میری پیاری بہن کو واپس لا سکے گی اور میرے باپ کے قاتلوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گی۔"

عباس نے کہا۔

"علی! ہم پولیس پر بھروسہ کرنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟"

علی نے گردن اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ میں اپنے ڈیڈی کے قاتلوں اور اپنی بہن رُوبی کے اغوا کرنے والوں کو تباہ و برباد کر سکتا ہوں۔ تم شاید بھول گئے ہو کہ میرے ڈیڈی نے مجھے کمانڈو کی زبردست ٹریننگ دی تھی۔ شاید اِسی دن کے لیے انھوں نے مجھے کمانڈو بنایا تھا۔ ڈیڈی نے اپنے آخری خط میں لکھا ہے کہ جب تک میں ان کے قاتلوں سے ان

کے قتل کا بدلہ نہیں لے لیتا اور اپنی بہن کو کافروں سے واپس نہیں چھڑا لیتا، میری رُوح کو چین نہیں آئے گا۔"

عباس بولا۔

"لیکن علی! تم اکیلے کیا کر سکتے ہو؟"

علی نے سینہ تان کر کہا۔

"کمانڈو اکیلا ہی لڑتا ہے۔ وہ اکیلا ہی دشمن کی صفوں میں گھس کر انہیں تہس نہس کر دیتا ہے۔ یہی میرے ڈیڈی نے مجھے ٹریننگ دی تھی۔ اب میرا فرض ہے کہ میں اپنے باپ کے قاتلوں کو جہنم میں پہنچاؤں اور اپنی بہن کو واپس لاؤں۔"

علی کا دوست عباس کچھ کہنے لگا تو علی نے اُسے چُپ کراتے ہوئے کہا۔

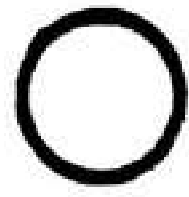
"عباس! میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ میں اپنے ڈیڈی کے قاتلوں اور اپنی بہن کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ تم سے میں صرف اتنا چاہوں گا کہ میرے بعد تم اس کوٹھی میں رہ کر فارم کے کام کی دیکھ بھال کرنا اور میرے بارے میں کوئی پوچھے تو صرف یہی بتانا کہ میں ایک ضروری کام سے کراچی گیا ہوا ہوں۔"

پھر علی نے اپنے ڈیڈی کا آخری خون آلود خط

نکال کر عباس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
"یہ میرے باپ کی آخری نشانی ہے۔ اِسے میری امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھنا۔"
علی نے اپنے باپ کے خون آلود خط کو سبز ریشمی رومال میں لپیٹ کر اپنے دوست عباس کو دے دیا اور خود اوپر اپنے ڈیڈی کے کمرے میں آگیا۔ ڈیڈی کے کمرے میں آتے ہی ان کی تصویر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے اپنے ڈیڈی کی پُرانی الماری کھولی۔ اس کے نچلے دراز کو کھولا۔ اس دراز میں سبز رنگ کی ایک ڈبی تھی۔ علی نے بڑی عقیدت بھرے ہاتھوں سے ڈبی کا ڈھکن اُٹھایا تو اُس کے اندر چاندی کا ایک گولڈ میڈل رکھا تھا۔ اُس میڈل پر ایک تلوار بنی ہوئی تھی۔ اُس کے اُوپر یا علی لکھا تھا۔ یہ علی کے ڈیڈی ریٹائرڈ کیپٹن کمانڈو بہادر حسین شاہ کا کمانڈو کا نشان تھا جو انہیں بہادری کے صلے میں اُن کی کمانڈو رجمنٹ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ یا علی کمانڈو کا نعرہ ہوتا ہے۔ کمانڈو دشمن پر ٹوٹ پڑنے سے پہلے ہمیشہ یا علی کا نعرہ بلند کرتا ہے۔
علی نے اِس میڈل کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور

اس پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں یا علی کا نعرہ لگایا اور کہا "ڈیڈی! میں کمانڈو علی ـــــ آپ کا بیٹا ـــــ اس مقدس نشان پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ دشمن کافروں پر بجلی بن کر ٹوٹوں گا اور اُن سے آپ کے قتل کا بدلہ لوں گا اور اپنی بہن کو اُن کے نرغے سے نہ صرف نکال کر لاؤں گا بلکہ جنھوں نے میری بہن کو اغوا کیا ہے اُن کے خاندان کے ایک ایک شخص کو جہنم میں پہنچا دوں گا۔"

علی نے ایک بار پھر میڈل کو چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ میڈل والی ڈبی کو بند کر کے دراز بند کیا۔ الماری کو تالا لگایا اور تیز تیز قدموں سے چلتا اپنے کمرے میں آگیا۔



قاتل کی تلاش

علی نے اپنے کمرے میں آکر الماری میں سے اپنا کمانڈو چاقو نکالا۔ اِسے کھول کر چُوما۔ اِسے بند کر کے جیکٹ کی جیب میں رکھا۔ پھر اپنے بارہ بور کے جرمن پستول میں پورا میگزین بھرا۔ چھ میگزین کے پیکٹ اپنی جیکٹ کی جیب میں سنبھال کر رکھے۔ الماری کے نچلے خانے میں اُس نے اپنے چھ سو روپے رکھے تھے، وہ نوٹ بھی اس نے نکال کر اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں ٹھونس لیے۔ پستول کو چُوم کر اسے جیب میں ڈالا اور نیچے آگیا۔ اس کا دوست عباس ڈرائنگ روم میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اُس نے علی کو آتے دیکھا تو رُک گیا۔ علی کی آنکھوں میں خُون اترا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ انتقام کی آگ میں سُرخ ہو رہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر علی سے کہا۔

"میرے دوست! ایک بار پھر سوچ سمجھ لو۔ تم دشمن کافروں کے ملک ہندوستان جا رہے ہو۔ تم ـــــ تم بارڈر کس طرح کراس کرو گے!"

علی نے اپنے دوست عباس کو ہاتھ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"عباس! کمانڈو ایسی باتیں نہیں سوچا کرتے۔ کمانڈو صرف اللہ، اُس کے رسولؐ پر بھروسہ کر کے اپنے خطرناک مشن پر نکلتا ہے۔ وہ دشمنوں کے درمیان اپنا راستہ بناتا جاتا ہے۔ میں کمانڈو بوائے ہوں۔ کمانڈو علی ہوں۔ میں کسی بے گناہ کو قتل کرنے نہیں جا رہا۔ میں اپنے باپ کے قاتلوں سے قتل کا بدلہ لینے جا رہا ہوں۔ میں اپنی اغوا کی گئی معصوم بہن کو کافروں کے پنجے سے چھڑانے جا رہا ہوں۔ تم مجھے کیوں روکتے ہو!"

عباس نے کہا۔

"میں تمہیں روکتا نہیں ہوں علی! بلکہ مجھے تمہاری فکر ہے۔ ہندوستان ایک دشمن ملک ہے۔ وہاں قدم قدم پر خطرہ ہے۔ بارڈر پر انڈین فوج بیٹھی ہے تمہارے پاس نہ پاسپورٹ ہے نہ ویزا ہے۔"

علی نے جیب سے پستول نکال کر اسے دکھاتے

ہوئے کہا۔

"یہ پستول ہی میرا پاسپورٹ ہے اور یہی میرا ویزا ہے"

علی آگے بڑھا تو عباس نے کہا۔

"مگر تم جاؤ گے کہاں؟ کہاں رہو گے؟ وہاں کیا کھاؤ گے؟"

علی دروازے پر پہنچ کر رُک گیا۔ اُس نے پلٹ کر عباس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"عباس! میں کمانڈو ہوں۔ اللہ کا شیر ہوں۔ علی کا شیر ہوں۔ اور شیر جہاں جاتا ہے اپنی خوراک اور جگہ خود پیدا کر لیتا ہے۔ تم اس گھر کی حفاظت کرنا۔ ہو سکتا ہے میں تمہیں کسی نا معلوم جگہ سے ٹیلی فون کروں"

یہ کہہ کر علی ڈرائنگ روم سے نکلا اور کوٹھی کے پیچھے اپنے ڈیڈی کی قبر پر گیا۔ فاتحہ پڑھی اور دعا مانگی۔ پھر اپنے باپ کی قبر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"ڈیڈی! میں آپ کے خون کا بدلہ لینے جا رہا ہوں میں قسم کھاتا ہوں جب تک اپنی پیاری بہن رُوبی کو دشمنوں سے نکال کر آپ کے قاتلوں کو موت کی نیند نہیں سُلا دوں گا، واپس نہیں آؤں گا"

یہ کہہ کر علی باپ کی قبر پر سے اٹھا اور کوٹھی کے گیٹ سے باہر آگیا۔ ایک رات کا اندھیرا چاروں طرف کھیتوں میں پھیل گیا تھا۔ علی کی شیراڈ کار کے پاس اس کا دوست عباس خاموش سر جھکائے کھڑا تھا۔ علی تیز تیز قدم اٹھاتا آیا۔ کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ عباس کو ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا، کار سٹارٹ کی اور اسے تیزی سے نکال کر کچی سڑک پر آگیا۔ اس کا رُخ انڈیا یعنی ہندوستان کے بارڈر کی طرف تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر گاڑی کی ہیڈ لائیٹس نہیں جلائی تھیں۔ وہ تیز رفتاری سے گاڑی کو بھگائے لیے جا رہا تھا۔ ان سارے علاقوں سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سمگلر کس راستے سے بارڈر کراس کرتے ہیں۔

چاروں طرف کھیتوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ تاروں کی روشنی بڑی پھیکی پھیکی تھی۔ درخت سایوں کی طرح لگ رہے تھے۔ علی کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ وہ پُرعزم آنکھوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سٹیرنگ پر دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے۔ کافی دور جانے کے بعد کچی سڑک پر سے اُتر کر علی ایک پتھریلے راستے پر آگیا۔

یہاں کار کے نیچے پتھر اُڑنے لگے۔ علی نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ عباس نے کہا۔

"علی! کیا تم دن کو بارڈر کراس نہیں کر سکتے تھے؟"

علی نے کرخت آواز میں کہا۔

"نہیں!"

اور گاڑی کو بڑی احتیاط سے چلاتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ اب دور سامنے پہاڑ نظر آنے لگے تھے۔ اِن پہاڑوں کے پار دشمن کافروں کا ملک تھا۔ جہاں اس کے باپ کے قاتل رہتے تھے اور جہاں اس کی پیاری بہن رُوبی اپنے بھائی کے آنے کا اِنتظار کر رہی تھی۔

دس پندرہ میل چلنے کے بعد گاڑی چھوٹے چھوٹے ٹیلوں اور پہاڑیوں کے درمیان آ گئی۔ اِن ٹیلوں اور پہاڑیوں پر چھوٹے قد کی جھاڑیاں چھتریوں کی طرح اُگی ہوئی تھیں۔ اب راستہ پتھروں سے بھرا ہوا تھا اور گاڑی کا آگے جانا ممکن نہ تھا۔ علی نے گاڑی ایک طرف روک لی۔ باہر نکل کر اپنی بائیں جانب والی چھوٹی پہاڑی کو اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ اُس نے پہاڑی کو پہچان لیا تھا۔

پھر اپنے دوست عباس کی طرف پلٹ کر بولا۔
"عباس! تم گاڑی واپس لے جاؤ۔ خدا حافظ!"
اور وہ عباس کے جواب کا انتظار کیئے بغیر پہاڑی کی طرف بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرے نے اسے اپنے اندر چھپا لیا۔ عباس نے ہاتھ اُٹھا کر خدا کے حضور علی کی زندگی کی دُعا مانگی اور گاڑی لے کر واپس روانہ ہوگیا۔

علی کچھ دُور پہاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا گیا آگے ایک گہری گھاٹی تھی۔ اِس گھاٹی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لیکن علی کو معلوم تھا کہ وہاں ایک برساتی نالہ ہے جس کے دوسری طرف ایک سُرنگ بنی ہوئی ہے۔ اُسے اِس سُرنگ تک پہنچنا تھا۔

علی اب ایک بہادر کمانڈو بن گیا تھا۔ وہ ایک پتھر سے چھلانگ لگا کر اندھیرے میں دوسری چٹان پر آگیا۔ جُھک کر چلتے ایسی آنکھوں سے گھاٹی میں دیکھا۔ پھر کان لگا کر سُنا۔ جب اُسے یقین ہوگیا کہ گھاٹی میں کوئی فوجی گشت نہیں لگا رہا تو ایک طرف پتھروں کی ڈھلان پر سے اُترتا ہوا نیچے گھاٹی کے برساتی نالے میں آگیا۔ نالہ خشک تھا۔ اِس نالے میں صرف برسات کے

دنوں میں پانی آتا تھا۔

علی ایک جانباز کمانڈو کی طرح چاروں طرف اندھیرے میں دیکھتا، پودوں اور درختوں کی خاص قسم کی خوشبوؤں کو سونگھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس نے کمانڈو چاقو کھول کر اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا کہ اگر کسی طرف سے کوئی لومڑ یا ریچھ اس پر حملہ کر دے تو وہ اس کا مقابلہ کر سکے۔

جب وہ برساتی نالے کو پار کر گیا تو اس کے سامنے ایک اُونچا پہاڑ آگیا۔ یہی وہ پہاڑ تھا جس کے اندر ایک سُرنگ بنی ہوئی تھی جو پہاڑوں کے اندر ہی اندر سے ہوتی ہندوستان کے بارڈر کے کنارے پر جا نکلتی تھی۔ علی پہلے کبھی اس سُرنگ میں سے نہیں گزرا تھا۔ اُس نے سمگلروں کی زبانی سُن رکھا تھا کہ سُرنگ خطرناک ہے اور اِس کے اندر بچھو اور کبھی کبھی کوئی خونخوار ریچھ بھی موجود ہوتا ہے۔ شاید اِسی لیے اب سمگلر اِس سُرنگ کے ذریعے بارڈر کراس نہیں کرتے تھے۔

لیکن علی اِسی سُرنگ کے ذریعے بارڈر کراس کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ سُرنگ میں وہ محفوظ تھا۔ باہر کھلی جگہ سے بارڈر کراس کرنے کا اِسے تجربہ نہ تھا۔ کسی

بھی طرف سے سکیورٹی فورس والوں کی گولی آکر اس کا کام تمام کر سکتی تھی۔ سُرنگ میں اندھیرا تھا۔

علی نے اللہ کا نام لیا اور سُرنگ میں داخل ہو گیا۔ کھلا ہوا کمانڈو چاقو اُس کے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ وہ سُرنگ کی دیوار کے ساتھ لگ کر چل رہا تھا۔ سُرنگ کے فرش پر چھوٹے بڑے پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ دُور چلنے کے بعد سرنگ بائیں جانب گھوم گئی۔ یہاں کمانڈو علی رُک گیا۔ اس نے کان لگا کر دوسری طرف اندھیرے اور خاموشی میں سُننے کی کوشش کی۔ اُدھر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ علی کے پاس ماچس موجود تھی لیکن وہ اِسے جلانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ خطرہ تھا کہ دشمن وہاں چھُپا ہوا ہو اور روشنی میں اُسے علی کی شکل نظر آجائے۔ وہ دیوار پر ہاتھ رکھے قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

اچانک اُسے کسی جانور کے خوخو کرنے کی آواز سنائی دی۔ علی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ چاقو والا ہاتھ اوپر اُٹھا لیا کہ اگر جانور اس پر حملہ کرے تو اپنی حفاظت کر سکے۔ ایک جانور خوخو کرتا بھاگتا ہوا اُس کے آگے سے گزر گیا۔ یہ شاید کوئی سُوّر تھا۔ جب اس کی آواز دُور

ہوگئی تو علی پھر آگے بڑھنے لگا۔

سرنگ دو تین موڑ مڑنے کے بعد سیدھی ہوگئی تھی۔ علی کے آگے کئی جالے لٹکے ہوئے آئے جنھیں وہ ہاتھ سے توڑتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ ابھی تک اُسے دوسری طرف سے کوئی روشنی نظر نہیں آئی تھی۔ ایک جگہ اُسے پانی گرنے کی آواز آئی۔ پہاڑی کے اندر کسی جگہ سے پانی نکل کر نیچے ایک چشمے میں گر رہا تھا۔ علی وہاں سے بھی گزر گیا۔

وہ کافی دیر تک سرنگ کے اندر قدم قدم چلتا رہا۔ سردی کے باوجود اُسے پسینہ آگیا تھا۔ آخر اس نے سُرنگ کا موڑ ایک جگہ سے کاٹا تو اس کے پسینہ بھرے چہرے سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ٹکرایا۔ وہ سمجھ گیا کہ سرنگ کا دوسرا سرا قریب ہی ہے۔

علی نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ تھوڑی دیر بعد اسے سُرنگ کے اندھیرے میں دور ایک پھیکی پھیکی نیلی روشنی کا دائرہ سا نظر آیا۔ یہ سرنگ کا دوسرا دروازہ تھا علی دبے پاؤں قدم اُٹھاتا سرنگ کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا سرنگ کے دوسرے سرے پر آکر بیٹھ گیا۔ چاقو اس نے بند کر کے جیب میں رکھ لیا اور دوسری جیب

سے آٹومیٹک جرمن پستول نکال کر اس کے میگزین کو چیک کیا اور سرنگ کے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس کے سامنے ایک کھلی جگہ تھی۔ ایک ویران میدان سا تھا، وہ سمجھ گیا کہ یہ انڈیا اور پاکستان کی سرحدوں کے درمیان کی جگہ ہے جسے نومینز لینڈ کہا جاتا ہے۔ ایک جیپ تیزی سے گزر گئی جس کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ علی نے جلدی سے اپنا سر نیچے کر لیا۔

اب یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ سامنے ہندوستان کا علاقہ شروع ہوتا تھا جہاں علی کے ڈیڈی کے قاتل اور اس کی بہن کو اغوا کرنے والے رہتے تھے اور جن سے خونی انتقام لینے علی یہاں جا رہا تھا۔

جب جیپ کی آواز دور جا کر پہاڑی علاقے میں گم ہو گئی تو علی نے اللہ کا نام لیا اور سرنگ سے باہر نکل آیا۔ وہ جھک کر ایک ایک قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔ ہر طرف موت ایسی خاموشی تھی۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ستاروں کی روشنی میں کھلا پہاڑی میدان ایسے نظر آ رہا تھا جیسے علی نے آنکھوں پر گہرے کالے شیشوں والی عینک چڑھا رکھی ہو۔

آٹومیٹک پستول علی کے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ ایک

جگہ بیٹھ گیا اور رات کے اندھیرے میں سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ سامنے تھوڑی سی کھلی زمین تھی۔ اُسے دوڑ کر اِس زمین کو پار کرنا تھا۔ پھر وہ پاکستان سے نکل کر ہندوستان میں داخل ہو جاتا۔

اِس کھلی جگہ کو پار کرنے میں خطرہ بھی تھا۔ دونوں طرف سرحد سے گولی آکر اُسے ہلاک کر سکتی تھی۔ لیکن علی کو ہر حالت میں یہ علاقہ پار کرنا تھا۔ اگر وہ سمگلر ہوتا تو موقع پاکر دوڑ کر وہ کھلی جگہ پار کر لیتا۔ مگر علی سمگلر نہ تھا۔ وہ ایک کمانڈو بوائے تھا۔ وہ ایک بہادر اور خطروں کا مقابلہ کرنے والے کمانڈو کی طرح یہ علاقہ پار کرنا چاہتا تھا۔

علی فوراً زمین پر اوندھے منہ لیٹ لیا اور کہنیوں کے بل آگے رینگنا شروع کر دیا۔ وہ زمین پر مگرمچھ کی طرح لیٹ رہا تھا۔ جھاڑیاں ختم ہونے پر کھلی جگہ آ گئی۔ علی نے اپنا سر نیچے کر لیا اور آہستہ آہستہ آگے رینگنے لگا۔

اگر علی کو اُس کے ڈیڈی نے کمانڈو کی ٹریننگ نہ دی ہوتی تو اس کے لیے یہ میدان رینگ کر پار کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ لیکن کمانڈو ہونے کی وجہ سے وہ میدان

پار کر کے دوسری طرف جھاڑیوں میں پہنچ گیا۔ وہاں جاتے ہی اُس نے اپنا سر نیچے ڈال لیا اور سانس درست کرنے لگا۔ جب ذرا اس کا سانس ٹھیک ہوا تو اُس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اُس کے سامنے اندھیرے میں چھوٹے چھوٹے ٹیلے پھیلے ہوتے تھے۔ کہیں کہیں درخت اور جھاڑیاں بھی تھیں۔

علی یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا وہ ہندوستان کے علاقے میں پہنچ گیا ہے یا ابھی تک پاکستان میں ہی ہے۔ وہ اُٹھا اور جھک کر آگے بڑھا۔ خطرہ تھا کہ کہیں آس پاس ہی کوئی ہندوستانی سیکورٹی فورس یا فوج کا کوئی مورچہ نہ ہو۔ اب گولی کے جواب میں گولی چلانا خطرناک بات تھی۔ چنانچہ علی نے آٹومیٹک پستول جیب میں رکھ کر چاقو نکال کر پکڑ لیا۔ وہ جھاڑیوں اور درختوں کے پیچھے چھپے ہوتا ایک ٹیلے کی طرف بڑھا تو اُسے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سُنائی دی۔

علی جلدی سے ٹیلے کی دیوار کے ساتھ اندھیرے میں ہو گیا۔ آواز قریب آ رہی تھی۔ یہ دو انڈین فوجی تھے ایک کہہ رہا تھا:

"بھگوان نے چاہا تو مجھے چھٹی مل جائے گی۔ میں چند دی

گڑھ جاکر اپنی بیمار بیوی کی دیکھ بھال کرنا چاہتا ہوں"۔
دوسرے فوجی نے کہا۔
"صوبیدار تیواڑی لال تمہاری درخواست منظور کرلے گا۔ تم فکر نہ کرو"۔

دونوں باتیں کرتے علی کے قریب سے گزر گئے۔ علی نے اپنا سانس روک رکھا تھا۔ ان کی باتوں سے ثابت ہوگیا تھا کہ یہ ہندوستان کا علاقہ ہے۔ علی نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ ہندوستان کے علاقے میں داخل ہوچکا تھا۔ اُس نے چاقو بند کرکے جیب میں ڈالا اور ٹیلے کی اوٹ سے نکل کر سامنے والی پہاڑی کی طرف چلنے لگا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم اُٹھا رہا تھا۔ اِسے کمانڈو ٹریننگ میں جنگل میں اِس طرح سے چلنا سکھایا گیا تھا کہ اُس کا پاؤں اگر سوکھے پتوں پر بھی پڑے تو آواز پیدا نہ ہو۔

اِتنا علی کو معلوم تھا کہ یہ ہندوستان کا جموں کا پہاڑی علاقہ ہے۔ مگر اُسے یہ پتہ نہ تھا کہ اس کے باپ کے قاتل اور اس کی بہن روبی کو اغوا کرنے والے بدمعاش گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس اِسی علاقے میں چھپے ہوئے ہیں یا کہیں آگے دلی وغیرہ کی طرف نکل گئے ہیں۔

علی نے سِکھ سمگلر گنڈا سنگھ کو ایک دربار میں دیکھا تھا جب وہ دن کے وقت اس کے ڈیڈی سے ملنے اور انہیں سمگلنگ میں اپنے ساتھ شامل کرنے کے سلسلے میں آیا تھا۔ مگر علی نے دوسرے ہندو سمگلر ٹیکم داس کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ علی کے ڈیڈی نے اپنے آخری خط میں یہی لکھا تھا کہ مجھے گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس نے قتل کیا ہے۔ اس کا مطلب صاف یہی نکلتا تھا کہ یہی لوگ اس کی بہن کو بھی اس کے ڈیڈی کے خط کے مطابق اغوا کر کے لے گئے تھے۔ گنڈا سنگھ کو علی شکل دیکھتے ہی پہچان سکتا تھا۔ لیکن ٹیکم داس کا سُراغ لگانا بھی کوئی مشکل بات نہ تھی۔ علی تو یہی عہد کر کے گھر سے نکلا اور بارڈر کراس کر کے ہندوستان میں آیا تھا کہ وہ ان دونوں بدمعاشوں، کافروں اور قاتلوں سے بدلہ بھی لے گا اور اپنی پیاری بہن کو ان کے چُنگل سے آزاد بھی کرائے گا۔

علی یہی دل میں سوچتا پہاڑی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ کُھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ رُک رُک کر چل رہا تھا۔ اچانک علی کا پاؤں ایک پتھر سے اس طرح سے ٹکرایا کہ وہ پھسل گیا اور گر پڑا۔ اُسی وقت کسی

نے آواز دی۔

"ہالٹ! کون ہے؟"

علی بجلی ایسی تیزی سے اٹھ کر ایک بڑے درخت کے پیچھے اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔

"حوالدار منگل سنگھ! اِدھر کون تھا؟"

پہلے نے جواب دیا۔

"آواز میں نے بھی سُنی ہے۔ میں دیکھتا ہوں"۔

علی سانس روک کر بیٹھا رہا۔ اندھیرے میں وہ آنکھیں پھاڑے اِردگرد دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ غلطی سے اِنڈین بارڈر سیکورٹی فورس کی کسی چوکی کی طرف نکل آیا ہے۔ اُسے جھاڑیوں میں کسی کے چلنے کی آواز سُنائی دی۔ کوئی اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ علی چوکنّا ہوگیا۔

اندھیرے میں اُس نے ایک سِکھ فوجی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا چلا آرہا تھا۔ علی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آہستہ سے اُٹھ کر درخت کے پیچھے اس طرح سے کھڑا ہوگیا کہ اگر اس پر حملہ ہو تو وہ اُس کا

مقابلہ کر سکے۔ سکھ فوجی نے اپنے ساتھی کو آواز دی :

"اوئے ستیا رام ! اِدھر تو کوئی نہیں ہے ؟"

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"حوالدار منگل سنگھ کوئی پاکستانی جاسوس نہ ہو۔ غور سے تلاش کرو۔"

یہ سکھ حوالدار منگل سنگھ تھا۔ وہ اس درخت کی طرف آیا جس کے پیچھے علی چھپا ہوا تھا۔ علی کے اندر کا کمانڈو پوری طرح سے بیدار ہو چکا تھا۔ اُس نے کھلا کمانڈو چاقو مضبوطی سے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ وہ ہر قسم کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ سکھ حوالدار درخت کے بالکل قریب علی کی طرف پیٹھ کر کے رُک گیا۔ رائفل اُس نے اِس طرح ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی جیسے ابھی فائرنگ شروع کر دے گا۔ علی ساکت سا بُت بنا درخت کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ بالکل آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ سارا جنگل خاموش تھا۔

پہلے تو علی نے سوچا کہ وہ خاموشی سے رینگتا ہوا وہاں سے دوسری طرف نکل جائے۔ لیکن بہت جلد اُس نے محسوس کیا کہ ایسا کرنے سے آواز پیدا ہو گی

اور سِکھ حوالدار اِسے فوراً گولی مار کر ہلاک کر ڈالے گا۔
علی ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کے سامنے ایک بہت
بڑا مِشن تھا۔ اُس کی منزل ابھی دُور تھی۔

چنانچہ علی نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اس سِکھ
حوالدار سے پیچھا چھڑانا چاہیے۔ اور اس سے پیچھا
چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اُسے کمانڈو کے
طریقے سے ہلاک کر دیا جائے اور ایسے ہلاک کیا جائے
کہ اس کی ہلکی سی آواز بھی نکل نہ سکے۔ اس کی ٹریننگ
علی نے اپنے کمانڈو ڈیڈی سے خاص طور پر حاصل
کی تھی۔

سِکھ حوالدار درخت سے پیٹھ لگا کر کھڑا تھا اور
رائفل پکڑے اندھیرے میں دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔
مورچے میں سے سیتا رام کی آواز پھر آئی۔

"اوئے حوالدار! کیا کر رہے ہو؟" دشمن مِلا کہ
نہیں؟"

حوالدار منگل سِنگھ نے جواب دیا۔

"اوئے تم چپ کر کے بیٹھے رہو۔ اگر یہ پاکستانی
جاسوس ہے تو میں اِسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اِتنی دیر میں علی نے ایک ماہر کمانڈو کی طرح یہ

حساب لگا لیا تھا کہ اُسے کس طرف سے چاقو کا وار کرنا ہو گا۔ سکھ حوالدار درخت کے ایک طرف اور کمانڈو علی درخت کی دوسری طرف اندھیرے میں کھڑا تھا۔ علی اس طرح سے حملہ کرنا چاہتا تھا کہ سکھ حوالدار کو فائر کرنے یا مُنہ سے ذراسی آواز بھی پیدا کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ یہی ایک کمانڈو کا کمال ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر حوالدار نے فائر کر دیا تو وہاں سارے سپاہی خبردار ہو جاتے اور علی کے لیے وہاں سے فرار ناممکن تھا۔

کمانڈو علی کو ایک ہی وقت میں سکھ حوالدار کی گردن کو ایک بازو سے دبوچنا اور ایک ہی وقت میں چاقو اُس کی شہ رگ پر پھیرنا تھا۔ کمانڈو چاقو کے پھل پر دَرانتی کی طرح دندانے بنے ہوئے تھے۔ اس کے وار سے دشمن کی گردن کبھی سلامت نہیں رہ سکتی تھی۔ سکھ حوالدار وہاں سے آگے جانے ہی لگا تھا کہ علی نے دل میں یا علیؑ کا خاموش نعرہ لگایا اور شیر کی طرح لپک کر ایک بازو سکھ حوالدار کی گردن میں ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن پر پُوری طاقت سے چاقو پھیر دیا اور پھر جلدی سے اسے نیچے گرا دیا۔ سکھ حوالدار کی گردن آدھی سے زیادہ کٹ گئی تھی

اور وہ نیچے گرنے لگا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ سکھ حوالدار نہ تو فائر کر سکا اور نہ ہی حلق سے کوئی آواز نکال سکا۔

علی نے گردن سے نکلتے خون کے فوارے سے بچنے کے لیے حوالدار کو وہیں درخت کے نیچے پھینک دیا اور خود تیزی سے ایک طرف ہو گیا۔ اسے شہ رگ میں سے خون کے خرخر نکلنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

اب وہ اس طرف بڑھا جدھر سے اس سکھ حوالدار کے ساتھی سیتارام کی آواز آرہی تھی۔ علی اس کا بھی کام تمام کر دینا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کا پیچھا نہ کر سکے اور یا پیچھے سے اس پر فائرنگ نہ کھول دے۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد اُسے معلوم ہو جاتا کہ اس کا ساتھی ہلاک کر دیا گیا ہے۔

مورچے میں سے سیتارام کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔

"اوئے حوالدار! کہاں مر گیا ہے اوئے تو؟ بولتا کیوں نہیں؟"

اس آواز سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ علی کو پتہ چل گیا کہ سیتارام کہاں مورچہ بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔ اُس

نے ہاتھ میں خون آلود چاقو ابھی تک ویسے ہی پکڑا ہوا تھا۔ جدھر سے ہندو سپاہی سیتا رام کی آواز آئی تھی، علی اس طرف اندھیرے میں بڑھا۔ وہ جھکا ہوا تھا اور دبے پاؤں چل رہا تھا۔ ہندو سپاہی سیتا رام نے پھر آواز دی:

"حوالدار! تو بولتا کیوں نہیں؟"

پہاڑوں میں گہری خاموشی چھا گئی۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ اب مورچے میں سے علی نے چند قدم کے فاصلے پر ایک سپاہی کے سائے کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا اُس نے رائفل آگے کر رکھی تھی اور وہ جھک کر ادھر کو چل رہا تھا جدھر سے اسے مغل سنگھ کی پہلے آواز آئی تھی۔ اب اِس ہندو سپاہی کو بھی قتل کرنا ضروری ہو گیا تھا کیونکہ ظاہر ہے تھوڑی دیر بعد جب اُسے اپنے ساتھی کی خون میں لت پت لاش ملتی تو وہ ایک دم سے فائر کر کے دوسرے مورچے والوں کو ہوشیار کر دیتا اور پھر چاروں سے انڈین سیکیورٹی فورس کے سپاہی بھاگ کر وہاں آجاتے اور علی کے لیے وہاں سے نکلنا تقریباً ناممکن ہو جاتا

علی نے جلدی سے چاقو بند کر کے جیب میں

اور آٹو میٹک پستول نکال کر اس پر تیزی سے سائیلنسر چڑھا دیا۔ پستول کی نالی پر سائیلنسر چڑھا دینے سے پستول کے فائر کا دھماکا نہیں ہوتا بلکہ ذرا سی "ٹھک" کی آواز ہی سنائی دیتی ہے۔

ہندو سپاہی ایسے زاویے پر تھا کہ علی چاقو سے اس کی گردن نہیں کاٹ سکتا تھا۔

ہندو سپاہی قدم قدم اپنے ساتھی کی لاش کی طرف بڑھ رہا تھا جس پر ابھی تک اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔ علی لاش پر نظر پڑنے سے پہلے پہلے اِس ہندو سپاہی کو بھی جہنم میں پہنچا دینا چاہتا تھا۔ پستول پر اس نے سائیلنسر چڑھا لیا تھا۔ رات کی شبنم کی وجہ سے گھاس گیلی تھی۔ علی گھاس پر اوندھا لیٹ گیا اور تیزی سے ہندو سپاہی کی طرف بڑھا۔

اب ہندو سپاہی سیتا رام اپنے ساتھی حوالدار منگل سنگھ کی لاش کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ حوالدار منگل سنگھ کو شاید سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ وہ رائفل ایک طرف رکھ کر اسے ہلاتے ہوئے بولا۔

"حوالدار! کیا ہوا؟"

اندھیرے کی وجہ سے ابھی تک اس نے حوالدار کی کٹی ہوئی گردن نہیں دیکھی تھی۔ یہی حملہ کرنے کا وقت تھا۔ علی رینگتا ہوا اس کے بالکل پیچھے آگیا تھا۔ ہندو سپاہی نے اپنے پیچھے کسی کے رینگنے کی آہٹ سُنی تو تیزی سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ علی کے لیے اب وہ بالکل آسان نشانہ بن گیا تھا۔ علی نے پستول دونوں ہاتھوں میں اُوپر اٹھایا اور ہندو سپاہی کے ماتھے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔

"ٹھک" کی آواز کے ساتھ آٹومیٹک جرمن پستول میں سے فولاد کی گولی بجلی کی طرح نکل کر ہندو سپاہی کے ماتھے میں لگی اور اس کی کھوپڑی کے پچھلی طرف سے نکل گئی۔ ہندو سپاہی وہیں ڈھیر ہوگیا اور اوندھے مُنہ اپنے ساتھی حوالدار منگل سنگھ کی لاش پر گر پڑا۔ علی نے لپک کر اس کے سَر کو اُٹھا کر غور سے دیکھا۔ وہ مر چکا تھا۔ ماتھے میں گولی لگتے اور کھوپڑی کے کھُل جانے کے بعد اُس کے زندہ بچ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

علی کو یقین تھا کہ قریبی مورچے میں صرف یہ دونوں ہندوستانی سپاہی ہی تھے۔ وہ اُٹھ کر اندھیرے میں چلتا ان کے مورچے میں آگیا۔ یہ زمین کھود کر بنایا گیا

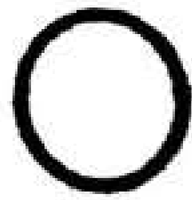
تھا۔ ایک گڑھا تھا جس میں ایک بھاری مشین گن لگی تھی۔ ایک طرف گولیوں کے پٹے پڑے تھے۔

اب وہاں علی کا کوئی کام نہ تھا۔ اُسے وہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ کوئی بھی فوجی جیپ گشت کرتے ہوئے وہاں آ سکتی تھی۔ مورچے میں ایک وائرلیس سیٹ بھی پڑا تھا۔ علی نے پستول پر لگا سائیلنسر رہنے دیا۔ اِسے اپنی جیب میں رکھا اور دوبارہ ہندوستانی فوجیوں کی لاشوں کے پاس آ گیا۔ اُس نے سیتا رام سپاہی کے جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک بٹوے سے اُسے کچھ ہندوستانی نوٹ ملے۔ علی نے وہ نوٹ نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔ آگے اُسے اِنڈین کرنسی کی سخت ضرورت تھی۔

علی وہاں سے نکل کر تیز تیز قدموں سے پیچھے کی طرف چل پڑا۔ آگے ایک میدان آ گیا جس کے دوسرے کنارے پر اُسے پہلی بار کسی گاؤں یا قصبے کی روشنیاں دکھائی دیں۔ وہ چلتا گیا۔ جب قصبہ قریب آیا تو وہ ایک کچی سڑک پر ہو گیا۔ رات کے وقت ویران سڑک پر چلنے سے اس پر شک کیا جا سکتا تھا اور پولیس کی تلاشی سے اُس کے قبضے سے آٹومیٹک پستول اور کمانڈو چاقو

برآمد ہو سکتے تھے۔ یہ خطرناک بات تھی۔

چنانچہ علی سڑک سے اتر گیا اور کھیتوں میں سے ہو کر گزرنے لگا۔ یہ جوار کے کھیت تھے۔ کھیت پہاڑی کی ڈھلان پر تھے۔ جب وہ کھیتوں سے نکل کر دوسری طرف آیا تو ستاروں کی روشنی میں اس نے ایک اور کھلا میدان دیکھا جس کے دوسری طرف کسی بہت بڑے شہر کی روشنیاں پہاڑی ڈھلانوں پر جھلملا رہی تھیں۔ علی کو یقین ہو گیا کہ یہ جموں شہر ہی ہو سکتا ہے۔ بارڈر پر رہ کر اپنے ڈیڈی کے قاتلوں گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس کو تلاش کرنا علی کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گنڈا سنگھ نے بارڈر کے پیچھے جموں شہر کے باہر کسی جگہ اپنا ایک اڈا بنا رکھا ہے جہاں وہ سمگلنگ کا سارا کاروبار اور لین دین کرتا ہے۔ علی اس کے خفیہ اڈے کا سراغ لگانا چاہتا تھا۔ علی کو یہ بھی معلوم تھا کہ گنڈا سنگھ بھی اسے پہچان لے گا اور پھر اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ علی چھپ کر گنڈا سنگھ کے اڈے پر پہنچنا چاہتا تھا۔



رُوبی کی چیخ نِکل گئی

سب سے پہلے علی کو گنڈا سنگھ بدمعاش کے خُفیہ اڈے کا سُراغ لگانا تھا۔ پھر اس سے اپنی بہن رُوبی کا پتہ چلانا اور آخر میں اُسے قتل کر کے اپنے ڈیڈی کے خون کا بدلہ لینا تھا۔

علی شہر کی روشنیوں کی طرف بڑھنے لگا جس کے بارے میں اُسے یقین تھا کہ یہ جموں شہر ہی ہے۔ علی پہلے کبھی اس شہر میں نہیں آیا تھا۔ یہاں سوائے اُس کے باپ کے قاتل گنڈا سنگھ کے دوسرا کوئی اُس کی شکل سے واقف بھی نہیں تھا۔

جمُوں شہر کے بیچ میں دریائے توی بہتا ہے۔ اِس دریا کے دونوں جانب مکانوں اور عمارتوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ علی کو خیال آیا کہ وہ اس وقت شہر میں جائے جب صبح کا وقت ہو۔ شہر سے اُسے کوئی دِلچسپی

نہ تھی۔ وہ تو اپنی بہن کی تلاش میں تھا اور اپنے باپ
کے قاتلوں سے اِنتقام لینے آیا تھا۔ اس کے ذہن میں
ابھی تک یہی خیال تھا کہ گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس ہندو
سمگلر ابھی بارڈر کے آس پاس اپنے کسی خفیہ ٹھکانے
میں روبی کو چھپائے ہوئے ہوں ۔

علی نے فیصلہ کیا کہ وہ رات شہر سے دُور کسی جگہ
سو کر گزار دے گا اور صبح کو گنڈا سنگھ سمگلر کے خفیہ
اَڈے کا سُراغ لگانے کوشش کرے گا ۔

اَب تک اُس کے ہاتھوں دو کافروں کا خُون ہو
چکا تھا۔ علی کو اس کا ذرا بھی افسوس نہ تھا کیونکہ جب
آدمی اپنی عزت یا اپنے وطن کی عزت و وقار کے مِشن پر
روانہ ہوتا ہے تو پھر نہ اپنی جان کی پروا کرتا ہے اور
نہ دوسرے کی جان کی پروا کرتا ہے۔ علی کے باپ کو
ان کافروں نے ہلاک کیا تھا اور اس کی بہن رُوبی کو
بھی یہی کافر اٹھا کر لے گئے تھے۔ علی انہیں کیسے
معاف کر سکتا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اس دشمن ملک
کے سارے کافروں کو ایک ایک کر کے ختم کر دے ۔

پستول اور چاقو اُس کی جیب میں تھے ۔

علی نے شہر کی بجائے ایک پہاڑی ٹیلے کی طرف

چلنا شروع کر دیا۔ اِس ٹیلے کے دامن میں لکڑی کی ڈھلانی چھت والی ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ جو بالکل خالی پڑی تھی۔ اس کی چھت ایک طرف سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اندر اِدھر اُدھر سُوکھی گھاس بکھری تھی۔ رات ٹھنڈی تھی۔ علی کو رات گزارنے کے لیے یہ اچھی جگہ مل گئی تھی۔ جھونپڑی کی دیواریں بھی لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔

وہ فرش کی گھاس پر لیٹ گیا۔ فضا ہلکی ہلکی گرم تھی۔ اندھیرا تھا۔ وہاں کوئی آواز نہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد علی گہری نیند سو چکا تھا۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ جھونپڑی کے کُھلے دروازے سے دن کی روشنی اور تھوڑی سی دُھوپ اندر آ رہی تھی۔ علی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر جھونپڑی سے گردن نکال کر باہر دیکھا۔

آس پاس ہری بھری پہاڑیاں تھیں۔ سامنے سڑک کے پار جمّوں شہر کے مکان اور اُونچی ڈھلانوں پر عمارتوں کی چھتیں دُھوپ میں چمک رہی تھیں۔ سڑک پر درختوں کے جُھنڈ تھے اور گاڑیوں کے گزرنے اور ان کے ہارن کی آواز آ جاتی تھی۔

علی نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر تسلّی کر لی۔ اس کی جیب میں چاقو اور پستول موجود تھے۔ اُس نے وہ نوٹ باہر نکالے جو اسے انڈین سپاہی سیتارام کی تلاشی لینے پر ملے تھے۔ یہ ہندوستانی کرنسی کے دس دس روپے والے سات نوٹ تھے۔ کل ستّر روپے تھے۔ علی کے پاس چھ ۶۰۰ سو پاکستانی نوٹ بھی تھے جن کو ضرورت کے وقت وہ تبدیل کروا سکتا تھا۔

علی جھونپڑی کے پیچھے آ گیا۔ یہاں ایک قدرتی پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ علی یہاں منہ ہاتھ دھو کر تازہ دَم ہوا۔ رات کی نیند کی وجہ سے اس کی تھکان دُور ہو چکی تھی۔

علی جمّوں شہر کے سرحدی علاقہ کے قریب ہی رہنا چاہتا تھا کیونکہ سمگلروں کے اَڈّے عام طور پر سرحد کے قریب ہی ہوتے ہیں۔ علی کو ایک طرف سے بڑا اِطمینان تھا کہ جمّوں شہر اور گاؤں میں ہندوستانی مسلمان بھی بھاری تعداد میں آباد تھے۔ وہ کسی مسلمان سے مدد لے سکتا تھا۔ اگرچہ وہ وہاں کے ہر ہندوستانی مسلمان پر اِعتبار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ لوگ اُسے وہاں کی پولیس کے حوالے بھی کر سکتے تھے۔

علی جھونپڑی کے اندر بیٹھا غور کرنے لگا کہ اُسے

کس طرف نکلنا چاہیے۔ اُسے اب کیسی ترکیب اختیار کرنی چاہیے کہ وہ سب سے پہلے اپنی بہن رُوبی کا سُراغ لگا سکے۔ کافی دیر سوچنے کے بعد علی اِس نتیجے پر پہنچا کہ شہر جموں کے بارڈر کے قریب قریب کسی ہوٹل وغیرہ میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری حاصل کر کے یہاں رہ کر سمگلر قاتل گنڈا سنگھ کے خفیہ اڈے کو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ فیصلہ کر کے علی جھونپڑی سے نکلا اور شہر کی طرف چل پڑا۔ اس کے پیچھے وہ اونچی پہاڑیاں تھیں جن کے درمیان آگے جا کر ہندوستان کی سرحد تھی جسے پار کر کے وہ آیا تھا۔

چلتے چلتے علی شہر کے دریا والے پُل کے اس طرف ایک چھوٹی سی آبادی میں آ گیا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے جن کے درمیان ایک منزلہ، دو منزلہ لکڑی کے مکان بنے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر لوگ آ جا رہے تھے۔ اِس آبادی کے آگے ایک پکّی سڑک تھی جو دریا کے پُل پر سے گزر کر جموں شہر میں داخل ہو جاتی تھی۔

ٹھنڈے موسم میں دُھوپ بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ علی نے آبادی میں آتے ہی دیکھا کہ ایک دو منزلہ

پُرانی سی عمارت کے باہر "چاند ہوٹل" کا نام لکھا ہوا ہے، یہ کسی مسلمان کا ہوٹل لگتا تھا۔ کوئی مسلمان ہی اسے اپنے ہوٹل میں نوکر رکھ سکتا تھا۔ ہوٹل کی نوکری کے بعد علی کو رہنے کو جگہ بھی مل جاتی اور کھانے پینے کا مسئلہ بھی وقتی طور پر حل ہو جاتا۔

ہوٹل ایک دکان کی طرح تھا۔ دکان کے اندر ایک سفید پگڑی والا آدمی کاؤنٹر کے سامنے بیٹھا رجسٹر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ دوسری طرف چبوترے پر انگیٹھیاں بنی تھیں جن پر چائے کی کیتلیاں اُبل رہی تھیں۔ دکان کے اندر چند ایک میزوں پر جموں کے گاہک بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے اور ناشتہ کر رہے تھے۔ علی بھی اندر داخل ہو کر ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ میز پر بیٹھتے ہی علی نے ہوٹل کے سفید پگڑی والے بوڑھے مالک کے پیچھے ایک کیلنڈر لگا دیکھا جس پر مکہ مدینہ کی تصویر تھی۔ یہ مسلمان ہی کا ہوٹل تھا۔ علی نے ناشتے کا آرڈر دیا۔

وہ خاموشی سے ناشتہ کرتے ہوئے گہری نظروں سے اِردگرد کے ماحول کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اُس نے بل اَدا کیا اور وہیں بیٹھا رہا۔

جب گاہک ذرا کم ہوئے تو وہ اُٹھ کر ہوٹل کے مالک کے پاس گیا اور سلام کر کے بولا۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے میاں جی۔"

"کیا بات کرنی ہے برخوردار؟"

علی نے بڑا اُداس چہرہ بنا کر کہا۔

"میاں جی! مَیں دِلی سے آیا ہوں۔ مسلمان ہُوں۔ بے کار ہوں۔ کوئی نوکری دے دیں تو آپ کے بچّوں کو دُعائیں دوں گا۔"

ہوٹل کے مالک نے غور سے علی کو دیکھا اور پُوچھا

"تم پہلے بھی کبھی جموّں آئے ہو؟"

علی نے کہا۔

"جی نہیں میاں جی! میں پہلی بار آیا ہوں۔ میرے ماں باپ مَر چکے ہیں۔ چچا کے پاس دلی میں رہتا ہوں۔ اُس نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ جموّں صبح ہی آیا ہوں میاں جی۔ کہ یہاں اپنے ظالم رشتہ داروں سے دُور رہ کر زندگی کے دن پورے کر لُوں گا۔"

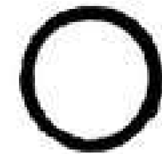
"تمہارا کیا نام ہے؟" ہوٹل کے مالک نے پوچھا۔

"علی عباس میرا نام ہے میاں جی!" علی نے عاجزی سے کہا۔

"پڑھے لکھے ہو؟" ہوٹل کے مالک نے پوچھا۔
"جی ہاں میاں جی! دس جماعتیں پڑھا ہوں"۔ علی نے جواب دیا۔ حالانکہ گریجویٹ ہونے کے علاوہ وہ زرعی یونیورسٹی سے بھی ایک امتحان پاس کر چکا تھا۔
ہوٹل کے مالک نے کہا۔
"ٹھیک ہے! یہاں کاؤنٹر پر بیٹھ کر حساب کتاب کر لیا کرو۔ اگر ایمان داری سے کام کیا تو تمہاری ترقی کر دوں گا۔ ابھی تمہیں صرف دو سو روپے تنخواہ ملے گی۔ کھانے کے علاوہ رہنے کے لیے ہوٹل کی چھت والی کوٹھڑی بھی مل جائے گی۔ بولو منظور ہے؟"
علی کو اور کیا چاہیے تھا۔ جلدی سے بولا۔
"مجھے منظور ہے میاں جی! خدا آپ کا بھلا کرے"۔
ہوٹل کے مالک نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔
"برخوردار علی! تم چونکہ مسلمان ہو۔ میں نے صرف اسی لیے تمہیں اپنے ہوٹل میں نوکری دی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ دوسرے شہروں سے آ کر بے کار مسلمان بچے ہندو سکھوں کے ہاں نوکریاں کرتے پھریں"۔
علی نے ایک بار پھر اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا۔
میاں جی نے اپنے ایک نوکر سے کہا۔

"رمجو! اوپر جاکر اس لڑکے کو کوٹھڑی دکھا دو۔"
رمجو بھی ہوٹل میں ملازم تھا اور گاہکوں کو چائے اور ناشتہ وغیرہ دیتا تھا۔ وہ علی کو اپنے ساتھ ہوٹل کی دوسری منزل والی چھت پر لے گیا جہاں کونے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ رمجو بولا۔

"میاں تم یہاں رات کو بستر لگاکر سو جایا کرنا۔"
اس طرح علی نے دشمن کافروں کے ملک ہندوستان کے شہر جموں کے ایک کشمیری مسلمان کے ہوٹل میں نوکری کرلی اور وہیں دوسری منزل کی کوٹھڑی میں رہنے لگا۔



اب ہم واپس علی کی بہن روبی کی طرف چل کر دیکھتے ہیں کہ وہ کس حال میں ہے۔
جب روبی فائرنگ کی آواز سن کر اپنے کمرے سے چیخ مار کر باہر نکلی تو اس نے اپنے پیارے ڈیڈی کو خون میں لت پت گرتے دیکھا۔ اس دوران میں ہندو قاتل ٹیکم داس بھی کھڑکی میں سے کود کر اندر آ گیا تھا۔ اسی نے روبی اور علی کے ڈیڈی پر گولی چلائی تھی روبی ایک زخمی شیرنی کی طرح اپنے باپ کے قاتلوں پر

جھپٹی مگر وہ غنڈوں کا مقابلہ کیسے کر سکتی تھی! اگندا سنگھ نے چیخ کر کہا۔

"اوئے ٹیکم داس! اس کا تو منھ بند کرو۔"

بہت جلد انھوں نے رُوبی کے منھ میں کپڑا ٹھونس کر اسے قابو میں کر لیا۔ اس کے ہاتھ پیچھے کو باندھے پھر اسے کاندھے پر ڈال کر یہ لوگ دوڑ کر دروازے میں سے باہر نکل گئے۔ روبی کے ڈیڈی بہادر شاہ کی کوٹھی سے دور ان قاتل سمگلروں کی جیپ کھڑی تھی۔ انھوں نے رُوبی کو جیپ میں ڈالا اور رات کے اندھیرے میں جیپ کو بھگاتے ہوئے خفیہ راستے سے پہاڑی بارڈر کراس کر کے ہندوستان کے علاقے میں پہنچ گئے۔

وہ جانتا تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ جیپ اب ہندوستان کے ویران پہاڑی راستے میں چلی جا رہی تھی۔ خراب راستوں پر اچھلتی دوڑتی جیپ آخر ایک جگہ درختوں کے پاس آ کر رُک گئی۔ روبی کے ہاتھ پیچھے بندھے تھے اور اس کے منھ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ وہ صرف سانس لے سکتی تھی، چیخ نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنے ڈیڈی کے قتل کے غم میں نڈھال نیم بے ہوش تھی۔ غنڈہ ٹیکم داس اسے پچھلی سیٹ پر بٹھا کے اس

کا سر نیچے کئے ہوئے تھا۔ گنڈا سنگھ نے ٹارچ نکالی اور تین بار روشنی کی۔ دُور درختوں میں سے بھی کسی نے ٹارچ سے تین بار روشنی کی۔

گنڈا سنگھ نے کہا۔ "سب ٹھیک ہے!" اور جیپ کو آگے بڑھا دیا۔

جدھر سے تین بار روشنی ہوئی وہاں ایک پُرانا سا مکان تھا۔ جس کے باہر گنڈا سنگھ کے تین ساتھی رائفلیں لیے پہرہ دے رہے تھے۔ گنڈا سنگھ نے جیپ سے اُترتے ہوئے کہا۔

"ہم شاہ جی کی لڑکی کو اُٹھا کر لے آئے ہیں اِسے اندر کوٹھڑی میں لے جاؤ۔"

ٹیکم داس اور دوسرے سمگلروں نے رُوبی کو مکان کی ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا اور باہر آ گئے۔ گنڈا سنگھ بولا۔

"ہم نے بہادر شاہ کو قتل کر دیا ہے۔ وہ ہماری بات نہیں مانتا تھا۔ اب ہمارا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ ہم لوگ بڑی آزادی سے بارڈر کراس کر کے ہیروئن کی سمگلنگ کر سکیں گے۔"

ٹیکم داس نے کہا۔

"گنڈا سنگھ! ہمیں اس لڑکی کو یہاں نہیں رکھنا چاہیے، کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔"
گنڈا سنگھ نے رائفل کو کاندھے سے اُتارتے ہوئے کہا۔
"اس لڑکی نے ہم میں سے کسی کو اپنے باپ کو قتل کرتے نہیں دیکھا۔ یہ عینی گواہ نہیں بن سکتی۔ اس لیے اُسے قتل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
ٹیکم داس بولا
"تو پھر کیوں نہ اُسے آگے بیچ کو مال کمائیں۔ لڑکی خوب صورت ہے! جوان ہے! ہمیں اس کے بیس پچیس ہزار ضرور مل جائیں گے۔"
گنڈا سنگھ کچھ سوچ کر بولا۔
"ٹھیک ہے! میں اسے جموں سے نکال کر دِلّی لے جاتا ہوں۔ وہاں اسے اپنے خفیہ اڈے پر رکھوں گا اور پھر چمپا بائی سے بات کر کے اسے پچیس ہزار کے عوض اس کے پاس بیچ دوں گا۔ میرے بعد تم سارا کام سنبھالے رکھنا۔ میں ابھی نکل جاتا ہوں تاکہ صبح ہونے سے پہلے پہلے جالندھر پہنچ جاؤں۔"
ٹیکم داس نے کہا۔

"سردار تم فکر نہ کرو! یہاں سب کام ٹھیک چلتا رہے گا۔ اس لڑکی کے باپ کے قتل کے بعد اب ہمارا راستہ کھل گیا ہے۔ میں کل رات ہی مال لے کر بارڈر کراس کر جاؤں گا۔ اور اُدھر سے سمگلنگ کا مال لے کر اڈے پر پہنچا دوں گا۔"

گنڈا سنگھ بولا۔

اِس لڑکی کا ایک بھائی بھی ہے جس کا نام علی ہے ہو سکتا ہے اُسے اپنے باپ کے قتل کا شبہ مجھ پر ہو۔ مگر وہ بارڈر کراس کر کے یہاں نہیں پہنچ سکتا۔ اور اگر یہاں آیا بھی تو میں اسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری ویگن نکال کر لاؤ اور بے ہوشی کا انجکشن بھی بھر کر لے آؤ۔"

گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس، دونوں قاتل سمگلروں نے کوٹھڑی میں جا کر روبی کو پکڑا اور اسے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا تاکہ وہ راستے میں شور نہ مچائے۔ روبی پہلے ہی غم کے مارے نیم بے ہوش ہو رہی تھی۔ اس نے پھر بھی انجکشن سے بچنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر غنڈوں کے آگے اُس کی ایک نہ چلی۔ انجکشن لگتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔ اسے اٹھا کر دوسری ویگن میں ڈال دیا گیا۔ یہ ویگن بالکل بند تھی۔ گنڈا سنگھ آگے بیٹھ گیا۔

اس نے بھرا ہوا ریوالور اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اپنے ساتھی قاتل سمگلر ٹیکم داس کو آخری بار ہدایت دی کہ پیچھے خبردار رہے اور ویگن لے کر جموں شہر سے دلی جانے والی سڑک پر آ گیا۔

اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ جموں شہر کی سڑکوں پر آمدورفت کم ہو رہی تھی۔ دوسری طرف اس وقت روبی کا پیارا بھائی علی یار ڈر کراس کر کے ہندوستان میں داخل ہو چکا تھا۔ مگر اُسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کی پیاری بہن کو گنڈا سنگھ سمگلر ویگن میں ڈال کر دلی کی بدنام عورت چمپا بائی کے پاس فروخت کرنے کے لیے لے جا رہا ہے۔

گنڈا سنگھ ویگن کو تیز رفتاری سے چلا رہا تھا۔ اُس نے اپنے پاس بے ہوشی کا ایک فالتو انجکشن بھی رکھ لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ روبی کو جو انجکشن لگایا گیا ہے اس کا اثر کل دوپہر تک ہی رہے گا۔ چنانچہ دوسرے دن دوپہر کو روبی کو بے ہوشی کا دوسرا ٹیکہ لگایا جانے والا تھا۔ ویگن شہر کی روشن سڑکوں پر سے گزرتی جموں شہر سے کٹھوعہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ راتوں رات گنڈا سنگھ ویگن کو لے کر جالندھر پہنچ گیا۔ جالندھر میں اُس نے

ایک خفیہ اڈے پر تھوڑی دیر آرام کیا، چائے پی اور ویگن لے کر ایک بار پھر جی ٹی روڈ پر نکل آیا۔

اب اس کا رُخ دِلّی شہر کی طرف تھا جو ہندوستان کا دارالحکومت ہے اور بہت بڑا شہر ہے۔ جالندھر شہر سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد دن نکل آیا۔ ویگن لدھیانہ پہنچی تو گنڈا سنگھ ایک دکان کے پاس رُک گیا جہاں اس نے ناشتہ کیا اور آگے روانہ ہو گیا۔

جب دن کے ساڑھے گیارہ بجے تو گنڈا سنگھ نے ویگن سڑک کے پار کھیتوں میں کھڑی کر لی۔ چاروں طرف کوئی آبادی نہیں تھی۔ سڑک پر سے کسی وقت کوئی ٹرک گزر جاتا تھا۔ گنڈا سنگھ انجکشن بھر کر ویگن کے اندر آ گیا۔ روبی اسی طرح بے ہوش پڑی تھی۔ گنڈا سنگھ نے اُسے ایک اور انجکشن لگا دیا۔ اب اُسے معلوم تھا کہ رُوبی کو رات کے گیارہ بجے تک ہوش نہیں آئے گا۔ اس طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد اُس نے ویگن سٹارٹ کی اور جی ٹی روڈ پر پوری رفتار سے چل پڑا۔

لدھیانے سے آگے انبالہ آ گیا۔ پھر میرٹھ اور آگے دِلّی کا علاقہ شروع ہو گیا۔ گنڈا سنگھ جب دِلّی شہر میں

داخل ہوا تو دن کے تین بج رہے تھے۔ کھانا اس نے راستے میں ہی کھا لیا تھا۔ گنڈا سنگھ ویگن کو لے کر سیدھا دِلّی کی ایک دریا پار والی بستی میں آ گیا۔

یہ بستی شہر کے گنجان علاقے سے دور ایک پُرانے مقبرے کے کھنڈر کے پیچھے آباد تھی۔ اس بستی کے کونے میں ایک پُرانا سا مکان سب سے الگ نیم کے درختوں تلے بنا ہوا تھا۔ مکان پر ویرانی اور نحوست برس رہی تھی۔ یہ گنڈا سنگھ کے ساتھی بدمعاش دھرمُو کا خفیہ اڈا تھا۔ دھرمُو نے گنڈا سنگھ کی ویگن کو پہچان لیا تھا۔ وہ مکان سے باہر نکل آیا۔ گنڈا سنگھ نے دھرمو بدمعاش کو ایک طرف لے جا کر سب کچھ سمجھا دیا۔ پھر انھوں نے بند ویگن میں سے بے ہوش رُوبی کو نکالا اور مکان کی سب سے پچھلی کوٹھڑی میں لے جا کر چارپائی پر ڈال دیا۔

گنڈا سنگھ نے دھرمُو سے کہا۔

"فوراً چمپا بائی کے ہاں جاؤ اور اُسے کہو کہ گنڈا سنگھ اُس کے لیے پاکستان سے ایک خوبصورت چیز لایا ہے۔ فوراً یہاں آ جائے۔"

دھرمو اسی وقت ویگن لے کر چمپا بائی کی طرف

روانہ ہوگیا جو دلّی شہر کے بدنام علاقے میں رہتی تھی۔ وہ ایک پرانی تجربے کار طوائف تھی اور اُس کا کام بھی یہی تھا کہ بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو خرید کر انہیں ڈانس کی ٹریننگ دیتی۔ پھر انہیں کوٹھے پر نچواتی اور سیٹھ لوگوں سے پیسے وصول کرتی تھی۔

یہ بڑا مکروہ اور گھناؤنا کاروبار تھا جو چمپا بائی کر رہی تھی۔ وہ کئی معصوم لڑکیوں کی زندگیاں برباد کر چکی تھی اور اب وہ رُوبی کی زندگی برباد کرنے والی تھی۔

دھرمو اسی وقت چمپا بائی کو ویگن میں بٹھا کر گنڈا سنگھ کے پاس لے آیا۔ گنڈا سنگھ اُسے مکان کی پچھلی کوٹھڑی میں لے گیا۔ وہاں بتّی جل رہی تھی۔ چمپا بائی نے بے ہوش روبی کو غور سے دیکھا۔ پھر کہنے لگی :

"گنڈا سنگھ لڑکی خوب صورت ضرور ہے مگر اناڑی ہے۔ اس پر محنت کرنی پڑے گی۔ اِسی لیے میں تمہیں اِس کے صرف پندرہ ہزار روپے دے سکتی ہوں۔ یہ رقم میں اپنے ساتھ لائی ہوں۔"

گنڈا سنگھ نے چمپا بائی سے کہا۔

"ایسا مال تمہیں پچاس ہزار میں بھی نہیں ملے گا تم سے آخری بات کرتا ہوں۔ پچیس ہزار سے ایک پیسہ بھی

کم نہیں لوں گا۔"

آخر بیس ہزار پر سودا ہو گیا۔ چمپا بائی نے اپنے پرس سے بیس ہزار روپے نکال کر گنڈا سنگھ کو دیئے اور کہا۔

"اس لڑکی کو ہوش کب آئے گا؟"

گنڈا سنگھ نے کہا۔

"رات کے دس گیارہ بجے تک بے ہوشی کے ٹیکے کا اثر ختم ہو جائے گا۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ اسے پہلے کچھ کھلا پلا دینا، پھر بات کرنا۔"

چمپا بائی مسکرا کر بولی۔

"میں سب جانتی ہوں۔ میں نے کوئی پہلی لڑکی نہیں خریدی۔ اب اسے میرے اڈے پر پہنچا دو۔"

گنڈا سنگھ نے بے ہوش روبی کو ویگن میں ڈالا اور دھرمو سے کہا۔

"اوئے دھرمو! اس لڑکی کو چمپا بائی کے اڈے پر چھوڑ کر واپس آ جاؤ۔ مجھے آج ہی واپس جموں پہنچنا ہے۔"

چمپا بائی ویگن میں دھرمو ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی اور ویگن دلی شہر کی سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی چمپا بائی کے خفیہ اڈے پر پہنچ کر رک گئی۔

یہ ایک پُرانی شکستہ سی کوٹھی تھی۔ چمپا بائی نے کوٹھی کے باہر "زنانہ سلائی گھر" کا جعلی بورڈ لگا رکھا تھا۔ اس کے اندر ایک تہ خانہ تھا جہاں وہ نئی بھولی بھالی لڑکیوں کو خرید کر رکھتی تھی اور پھر ان کو ڈانس کی تربیت دیتی تھی۔

یہاں اُس نے دو ہٹے کٹے بدمعاش رکھے ہوئے تھے۔ دونوں ہندو تھے۔ ایک کا نام ہریا اور دوسرے کا کانتی تھا۔ یہ دونوں بڑے سنگ دل بدمعاش تھے وہ فوراً بے ہوش روبی کو اُٹھا کر تہ خانے میں لے گئے دھرمو ویگن لے کر واپس چلا گیا۔

تہ خانے میں ایک پلنگ بچھا تھا۔ رُوبی کو اس پر ڈال دیا گیا اور اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ اس کے ہاتھ بھی کھول دیے گئے۔

چمپا بائی نے دونوں بدمعاشوں سے کہا۔

"لڑکی کا نام انھوں نے روبی بتایا ہے۔ یہ لوگ اِسے پاکستان سے اغوا کر کے لائے ہیں۔ لڑکی مسلمان ہے۔ اسے تہ خانے میں بند رکھو۔ میں رات کو آؤں گی۔ اِسے رات گیارہ بجے تک ہوش آجائے گا۔"

چمپا بائی پُرانی کوٹھی سے نکل کر شہر کے اس بدنام

علاقے میں چلی گئی جہاں اُس کا کوٹھا تھا اور جہاں وہ بھولی بھالی لڑکیوں کو طوائف بنا کر ڈانس کرواتی تھی۔ دونوں بدمعاش کوٹھے کے باہر پہرے پر بیٹھ گئے۔ رات کو چمپا بائی آ گئی۔ اس نے ہریا بدمعاش سے کہا۔

"جاؤ، بازار سے کچھ کھانے کو لے آؤ۔ لڑکی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ یہ لوگ اسے بارڈر سے ہی بے ہوش کر کے لائے ہیں۔"

ہریا بدمعاش بازار چل دیا۔ چمپا بائی اپنے دوسرے بدمعاش کانتی کے ساتھ تہ خانے میں آ گئی۔ تہ خانے کی چھت کا بلب جل رہا تھا۔ اِس وقت رات کے سوا گیارہ بج رہے تھے۔ رُوبی کو کچھ کچھ ہوش آ رہا تھا۔ بے ہوشی کے ٹیکے کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ چمپا بائی نے کوکا کولا گلاس میں بھر کر میز پر رکھ لیا اور ہندو بدمعاش کانتی سے بولی۔

"جا حرامی! تو باہر چلا جا۔ تیری شکل دیکھ کر یہ ڈر جائے گی۔"

کانتی باہر چلا گیا۔ اَب روبی کو ہوش آنے لگا تھا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کے سامنے ایک پکّی عمر کی عورت بیٹھی تھی جس نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔

اور پان چبا رہی تھی۔ رُوبی پریشان ہوکر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں کہاں ہوں؟" اُس نے کہا۔

چمپا بائی نے بڑی محبت سے روبی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔

"بیٹی! تو میرے گھر میں ہے۔ کچھ لوگ تجھے اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ میرا خاوند ان ظالموں سے تجھے چھڑا کر یہاں لے آیا۔ تو گھبرا مت! تو اپنے ہی گھر میں ہے۔ لے کوکا کولا پی لے!"

روبی بالکل معصوم تھی۔ وہ یہی سمجھی کہ شاید ان لوگوں نے اسے گنڈا سنگھ بدمعاش سے چھڑا لیا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چمپا بائی نے روبی کا ماتھا چوم کر کہا۔

"تو مجھے اپنی ماں ہی سمجھ۔ رومت! تو جہاں کہے گی تجھے پہنچا دوں گی۔ تو مسلمان ہے تو میں بھی مسلمان ہوں۔"

حالانکہ چمپا بائی مسلمان نہیں بلکہ ہندو عورت تھی۔ رُوبی نے ایک لمحے کے لیے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ سمگلر بدمعاشوں کے پنجے سے نکل آئی ہے۔ رُوبی روتے روتے چمپا بائی کے ساتھ لپٹ گئی اور روتے ہوئے

کہنے لگی۔

"ماں جی! ان لوگوں نے میرے باپ کو قتل کر دیا ہے۔ وہ مجھے اٹھا کر لے آئے تھے۔ انھوں نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ خدا کے لیے مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میرا بھائی علی میرے لیے پریشان ہو رہا ہوگا۔"

چمپا بائی نے رُوبی کو مکاری کے ساتھ تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی روبی! تُو پاکستان میں نہیں ہے۔ یہ بدمعاش تمہیں پاکستان سے اغوا کر کے ہندوستان لے آئے تھے یہ ہندوستان کا شہر دِلّی ہے۔ مگر تو فکر نہ کر۔ میں تمہیں کسی نہ کسی طرح تیرے گھر تیرے بھائی کے پاس پہنچا دوں گی۔ مجھے تیرے باپ کے قتل کا افسوس ہے مگر شکر کر کہ انھوں نے تجھے قتل نہیں کیا۔ یہ لوگ تو بڑے خوفناک غنڈے تھے۔"

رُوبی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ سمجھ گئی کہ چونکہ گنڈا سنگھ اور اس کا ساتھی سمگلر تھے اس لیے اُسے اغوا کر کے ہندوستان لے آئے ہیں۔

رُوبی نے اپنے ڈیڈی کی زبانی ان دونوں سمگلروں یعنی گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس کے نام خود سُن رکھے تھے۔

ڈیڈی کہا کرتے تھے۔

"یہ دونوں کافر سمگلر مجھے دھمکی دے رہے ہیں کہ اگر میں نے اُن کے ساتھ مل کر سمگلنگ میں ان کا ہاتھ نہ بٹایا تو وہ مجھے ہلاک کر دیں گے۔ مگر زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں سچا پاکستانی ہوں میں ان لوگوں کو بہت جلد پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

رُوبی نے اپنے باپ کے سمگلر قاتل گنڈا سنگھ اور ہندو سمگلر ٹیکم داس کو دیکھ بھی لیا تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ اپنے وطن پاکستان سے اتنی دور ایک دشمن ملک ہندوستان میں آ گئی تھی۔ اب خدا جانے یہاں سے وہ کب اور کیسے واپس ہو۔

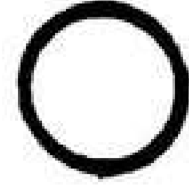
رُوبی پڑھی لکھی گریجویٹ لڑکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر ایک دشمن ملک میں سمگل کر کے لائی گئی ہے اور اسے کسی بھی وقت گرفتار کیا جا سکتا ہے اور جیل میں ڈالا جا سکتا ہے۔ وہ دل میں چمپا بائی کا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ اس نے اسے غنڈوں سے نجات دلائی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ اس عورت چمپا بائی نے اُسے اِن غنڈوں ہی سے بیس ہزار روپے میں خریدا ہے اور وہ اُسے ڈانسر

اور طوائف بنانے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔
رُوبی نے چمپا بائی سے پوچھا۔
"ماں جی! آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"
چمپا بائی نے عیاری کے ساتھ کہا۔
"تم نے بے ہوشی میں اپنا نام کئی بار لیا۔ تم کہہ رہی تھیں۔ ڈیڈی۔ رُوبی تمہارے قتل کا بدلہ لے گی۔ میں رُوبی تمہارے قتل کا بدلہ لُوں گی"۔
رُوبی پھر رونے لگ پڑی۔ اُسے اپنے باپ کی خُون میں لت پت لاش یاد آ گئی۔ چمپا بائی اُسے پیار کرتے ہوتے بولی۔
"رُوبی بیٹی! تو روتی کیوں ہے۔ میں بھی تیری ماں کی جگہ ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تیرا پاسپورٹ بھی بنوا دوں گی اور تجھے پاکستان بھی پہنچا دوں گی۔ یہ لے کوکا کولا پی لے"!
رُوبی نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ اُس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اُس نے تھوڑا سا کوکا کولا پیا۔ اِتنے میں کانتی بدمعاش ڈبے میں کھانا لے کر آ گیا۔ وہ دِلّی کے ایک ہوٹل سے کھانے کا ٹکس لایا تھا۔ رُوبی نے کانتی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جو

کسی بدمعاش کا چہرہ تھا۔ رُوبی کے دل میں شک سا ہوا۔ مگر چمپا پانی ؔ نے جلدی سے کہا۔

"یہ چراغ دین میرا خاوند ہے۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ یہی تجھے غنڈوں سے چُھڑا کر لایا ہے۔ یہ تمہارے لیے کھانا لایا ہے۔"

رُوبی خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔



کمانڈو ایکشن

کھانا کھانے کے بعد روبی کے جسم میں کچھ طاقت آ گئی مگر انجکشن کی وجہ سے ابھی تک اس کا سر چکرا رہا تھا۔ چمپا بائی نے روبی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اب تو تھوڑی دیر آرام کر لے بٹیا! رات کافی گزر گئی ہے۔ کل تیرے لیے میں پاسپورٹ بنانے کی کوشش کروں گی۔"

روبی نے کہا۔

"ماں جی! میرا پاسپورٹ بن جائے گا نا! میں اپنے بھائی علی کے پاس پاکستان پہنچ جاؤں گی نا!"

چمپا بائی نے روبی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں بیٹی! اللہ نے چاہا تو تو ضرور پاکستان اپنے بھائی علی کے پاس پہنچ جائے گی۔ اب تو سو جا!"

رُوبی بستر پر لیٹ گئی۔ چمپا بائی نے اُس کے اوپر کمبل ڈال دیا اور اُس کا ماتھا چُوم کر تہ خانے سے باہر نکل گئی۔ ہندو بدمعاش کانتی اُس کے ساتھ تھا۔ چمپا بائی نے بڑی آہستہ سے باہر تالا لگایا اور بدمعاش کانتی کو ساتھ لے کر تہ خانے کا زینہ چڑھ کر اوپر والے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کانتی بدمعاش کہنے لگا۔

" لڑکی پڑھی لکھی ہے چمپا بائی۔ اسے ڈانسر بنانے کے لیے کافی محنت کرنی پڑے گی۔ میرا مطلب ہے اس کو شاید ہنٹروں سے مارنا پڑے"۔

چمپا بائی نے ہندو بدمعاش کانتی کو گالی دے کر کہا۔

"اونچا مت بول۔ مجھے کیا کرنا ہے میں جانتی ہوں۔ اگر ہنٹر کی ضرورت پڑی تو اس لڑکی کو ایسے ہنٹر ماروں گی کہ اپنے آپ ہتھیار ڈال دے گی۔ ایسی کئی لڑکیاں میں دیکھ چکی ہوں اور آج وہ میرے کوٹھے پر لوگوں کے سامنے ڈانس کرتی ہیں۔ مگر ابھی ہمیں کم از کم ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں اسے آہستہ آہستہ اپنے راستے پر لاؤں گی۔ اب تُو اپنا بُرا منھ لے کر دوسرے کمرے میں جا کر سو جا۔ صبح دیکھا جائے گا"۔

کانتی بدمعاش اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رُوبی تہہ خانے میں پلنگ پر کمبل اوڑھے چھت کو تک رہی تھی۔ رُوبی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ ڈیڈی کے قتل کا صدمہ اُس نے اپنے اوپر سہہ لیا تھا۔ اُسے صبر آگیا تھا۔ اب وہ کسی طرح ہندوستان سے فرار ہو کر واپس پاکستان اپنے لاہور والے گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

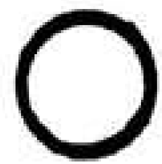
جب چمپا بائی تہہ خانے سے باہر گئی تھی تو رُوبی نے باہر دروازے کو تالا لگانے کی ہلکی سی آواز سُنی تھی۔ اس کے دل میں پہلے ہی کچھ شک پڑ چکا تھا۔ کیونکہ وہ مکان کے کسی ایسے کمرے میں تھی جہاں کھڑکیاں اور روشندان نہ تھے۔ یہ اسے ایک تہہ خانہ سا لگتا تھا۔ وہ پہلے ہی سوچ رہی تھی کہ اُسے اِس تہہ خانے میں کیوں رکھا گیا ہے۔ جب اُسے باہر سے تالا لگنے کی آواز آئی تو وہ غور سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پلنگ سے آہستہ سے اُٹھی اور دبے پاؤں بند دروازے کے پاس آکر رُک گئی۔ اُس نے دروازے کو آہستہ سے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔

رُوبی کا ماتھا ٹھنکا۔ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ یہ عورت مجھے مشکوک لگتی ہے۔ اس کی باتوں میں سچائی

نہیں ہے۔ روبی سوچنے لگی۔ وہ پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔ اور اپنے بھائی علی کو یاد کرنے لگی۔ جب وہ شہر سے واپس آیا ہوگا تو ڈیڈی کی لاش دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ رُوبی بھی غائب ہے، اُس پر کیا گزری ہوگی۔

رُوبی کی آنکھوں میں اپنے پیارے بھائی کو یاد کر کے آنسو آ گئے۔ اس کا دل یہ سوچ کر پریشان ہو گیا تھا کہ اس عورت نے جو اپنے آپ کو اُس کا ہمدرد اور مسلمان عورت ظاہر کرتی ہے، اُسے تالے میں کیوں رکھا ہے؟ اُس نے دروازے کے باہر تالا کیوں لگا دیا ہے؟ یہی سوچ سوچ کر رُوبی پریشان ہو رہی تھی۔ پھر اُسے نیند آ گئی اور وہ سو گئی۔



اَب ہم واپس اپنے کمانڈو بھائی علی کی طرف آتے ہیں۔

کمانڈو لیوائے علی جمّوں شہر سے باہر والی آبادی کے ہوٹل میں ملازم تھا۔ ہوٹل کے مالک میاں جی نے اُسے کاؤنٹر پر بیٹھا دیا تھا جہاں وہ ہوٹل کے حساب کے علاوہ گاہکوں کے بِل بھی بناتا تھا۔ مگر اُس کا اصلی مِشن اپنے باپ کے قاتلوں اور اپنی بہن کے اغوا کرنے والوں

کو تلاش کر کے اُن سے اِنتقام لینا تھا۔ چنانچہ دِن کے وقت وہ ہوٹل پر کام کرتا اور شام کو ہوٹل سے نکل کر اِدھر اُدھر سیر کرنے کے بہانے بارڈر والے علاقے کی طرف چل پڑتا۔ وہ اپنا آٹو میٹک ریوالور اور کمانڈو چاقو ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں اب بھی اس کے پاس تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس کا خفیہ اڈا وہیں سرحد کے آس پاس ہی کسی ویران جگہ پر ہوگا۔ شام کے اندھیرے میں وہ دیر تک ویران علاقوں میں گھومتا رہا۔ مگر اسے گنڈا سنگھ کے اڈے کا کوئی سُراغ نہ ملا۔

علی واپس ہوٹل پر آگیا۔ اُس نے کھانا کھایا اور اپنی کوٹھڑی میں آکر لیٹ گیا۔ اُس کے دل کو ذرا بھی چین نہ تھا۔ سب سے زیادہ فکر اُسے اپنی پیاری بہن رُوبی کی تھی کہ خدا جانے وہ کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی۔ وہ بالکل بے خبر تھا کہ گنڈا سنگھ نے اُس کی پیاری بہن رُوبی کو دِلّی کی بدنام عورت چمپا بائی کے ہاتھ بیس ہزار روپے میں بیچ دیا ہے اور وہ بے چاری دِلّی کی ایک شکستہ پرانی کوٹھی کے تہ خانے میں بند کر دی گئی ہے۔

علی کو نیند نہیں آرہی تھی ۔ وہ رُوبی کے خیال سے بے چین سا ہوکر اُٹھا اور نیچے ہوٹل میں آگیا۔ ہوٹل میں میاں جی نہیں تھے ۔ ایک دوسرا مُلازم کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ کچھ لوگ ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے ۔ علی خاموشی سے کونے والی میز پر بیٹھ گیا ۔ اِتنے میں ہوٹل کا بیرا اُس کے پاس آیا اور بولا ۔

"علی بھائی! چائے لاؤں تمہارے لیے ؟"

اور پھر ہوٹل کا بیرا علی جُو اپنے اور علی کے لیے چائے لے کر آگیا۔ دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے ۔ علی جُو نے علی سے پُوچھا ۔

"کیا بات ہے علی ؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ پریشان سے ہو!"

علی نے مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں بھائی! بس کسی وقت اپنی مرحُوم ماں بہت یاد آتی ہے ۔"

علی جُو آہ بھر کر کہنے لگا ۔

"مائیں تو ٹھنڈی چھاں ہوتی ہیں ۔ مجھے بھی اپنی مرحُوم ماں بہت یاد آتی ہے"

کمانڈو بوائے علی نے چائے کا ہلکا سا گھونٹ بھر

کر پوچھا۔

"یہ سارا علاقہ پاکستان کے بارڈر کے ساتھ لگتا ہے یہاں سمگلنگ تو بہت ہوتی ہو گی۔"

علی جو بولا۔

"بہت ہوتی ہے۔ آگے کا علاقہ ہی سمگلروں کا ہے"۔

تب علی نے کرید کرید کر پوچھا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہاں سے تین میل شمال مغرب کی طرف پُرانی پہاڑی کے پیچھے ایک گھاٹی کے پاس سمگلروں کا خُفیہ ٹھکانہ ہے علی نے پوچھا کہ پولیس وہاں چھاپہ کیوں نہیں مارتی جس پر ہوٹل کے بیرے نے کہا کہ جموں کشمیر کی پولیس اِن سمگلروں سے مِلی ہوئی ہے اور اُن سے اپنی کمیشن وصول کرتی ہے۔

علی نے اسی رات سمگلروں کے اِس خُفیہ ٹھکانے کا جائزہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اُوپر اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا۔ جب رات آدھی سے زیادہ گزر گئی بستی خاموش ہو گئی۔ ہوٹل بھی بند ہو گیا تو علی نے اپنا چاقو اور آٹومیٹک پستول ساتھ لیا اور ہوٹل کی سیڑھیاں اتر کر چپکے سے باہر نکلا اور شمال مغرب کی طرف جو پہاڑیاں تھیں اس طرف چل پڑا۔

رات ٹھنڈی تھی۔ سردی کی وجہ سے دُھند پھیلی ہوئی تھی۔ علی دُھندلی رات میں شمال مغرب کی طرف چھوٹے چھوٹے پتھروں اور پہاڑی درّوں میں سے گزرتا چلتا گیا۔ ہوٹل کے بیرے سے اس نے پرانی پہاڑی کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لی تھیں۔

جب وہ پرانی پہاڑی کے قریب پہنچا تو ایک جگہ رُک کر اندھیرے میں ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ جھاڑیوں میں کوئی جھینگر ٹھٹھری ہوئی آواز میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ ہر طرف ایک گہری خاموشی طاری تھی۔ پُرانی پہاڑ اُس کے سامنے تھی۔ اس کے پیچھے اِطلاع کے مطابق سمگلروں کا خفیہ اڈہ تھا۔

علی نے صرف گنڈا سنگھ کو دیکھا ہوا تھا۔ اُس کے دوسرے ہندو ساتھی ٹیکم کو علی نے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے ڈیڈی نے مرنے سے پہلے جو خط لکھا تھا اس میں یہی لکھا تھا کہ مجھے گنڈا سنگھ اور ٹیکم داس نے قتل کیا ہے۔ علی ان دونوں سے اپنے والد کے خُون کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اپنی بہن رُوبی کی تلاش بھی تھی جو اُس کے اندازے کے مطابق

وہیں کسی جگہ چھپائی گئی تھی۔
علی جھاڑیوں میں احتیاط سے قدم رکھتا پہاڑی کے پیچھے کی طرف چلا۔ آگے اندھیرا تھا۔ اسے اندھیرے میں ایک درخت کے نیچے جیپ کھڑی نظر آئی۔ علی نے جیب سے کمانڈو چاقو نکال کر پہلے ہی اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ جیپ کو دیکھتے ہی وہ زمین پر بیٹھ گیا اور اسی حالت میں کھسکتا جیپ کے قریب درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ جیپ خالی تھی۔ سامنے اسے دھندلا دھندلا سا ایک پرانے مکان کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔
اسے آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ علی نے اپنے آپ کو درخت کے پیچھے جھاڑیوں میں اچھی طرح سے چھپا لیا۔ دو آدمی مکان کے دروازے میں سے باتیں کرتے ہوئے جیپ کی طرف آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک ٹیکم داس تھا جس نے علی کے ڈیڈی کو ہلاک کیا تھا اور دوسرا اس کا ساتھی تھا۔ علی نے اپنا سانس روک لیا۔ دونوں سمگلر باتیں کرتے جیپ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ دوسرا اسمگلر بولا۔

"گنڈا سنگھ ابھی تک دِلّی سے کیوں نہیں آیا ٹیکم داس ؟"

ٹیکم داس کا نام سُنتے ہی علی کے خون میں آگ کے انگارے سُلگنے لگے۔ یہی اُس کے ڈیڈی کا قاتل تھا۔ علی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی جلدی اپنے باپ کے قاتل کے سامنے پہنچ جائے گا۔ ٹیکم کہنے لگا۔

"وہ دِلی گیا تھا مگر آج شام کو ہی اُس کا پیغام آیا کہ وہ دلّی سے ضروری مال لینے کسی دوسرے شہر جا رہا ہے۔ اب پتہ نہیں وہ کب آئے"۔

علی یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے باپ کا دوسرا قاتل گنڈا سنگھ دِلّی سے آگے کہاں گیا ہے۔ وہ غور سے ان دونوں کی گفتگو سُننے لگا۔ ان کی باتوں سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ گنڈا سنگھ دِلی سے آگے کہاں گیا ہے۔ ٹیکم داس نے پوچھا۔

"مال تم نے جیپ میں رکھ لیا ہے نا ؟"

دوسرے سمگلر نے کہا۔

"ہاں! سارا مال پیکٹوں میں بند جیپ کے خُفیہ خانے میں ہے"۔

ٹیکم داس بولا۔

"تو پھر تم بارڈر کی طرف نکل جاؤ۔ ابھی دُھند پھیلی ہوئی ہے ۔ اِس دُھند میں تمہیں بارڈر کراس کرنے میں آسانی رہے گی۔"

دوسرا اسمگلر جیپ میں بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"تم گنڈا سنگھ کو بتا دینا کہ اگلا پھیرا ایک ہفتے بعد ہوگا۔"

یہ کہہ کر اُس نے جیپ سٹارٹ کی اور بارڈر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس نے جیپ کی روشنیاں بُجھا رکھی تھیں ٹیکم داس جیپ کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ علی کے باپ کا قاتل اُس کی آنکھوں کے سامنے دس فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ شاید اس سے زیادہ بہتر موقع پھر ہاتھ نہ آئے۔ علی کا خون کھول رہا تھا۔ اُسے اپنی بہن رُوبی کا بھی اس شخص سے پتہ چلانا تھا۔ اگر اب یہ میرے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر نہ جانے کبھی ہاتھ نہ لگے ۔ علی کی گرفت کمانڈو چاقو پر مضبوط ہو گئی ۔ وہ درخت کے پیچھے سے نکل آیا۔ ٹیکم داس کی اس کی طرف پیٹھ تھی۔ اندھیرے میں وہ علی کو سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

علی خونخوار چیتے کی طرح چاقو سیدھے ہاتھ میں

پیے ٹیکم داس کی طرف بڑھا۔ ٹیکم داس کو اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی تو وہ جلدی سے پلٹا۔ اس کا ہاتھ اس کی جیب کی طرف گیا۔ شاید وہ پستول نکالنا چاہتا تھا مگر وہ ایک قاتل سمگلر تھا اور علی ایک کمانڈو بوائے۔ بزدل سمگلر کمانڈو کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ علی نے شیر کی طرح خاموش چھلانگ لگائی اور دوسرے ہی لمحے ٹیکم داس کی گردن اس نے بائیں بازو میں جکڑ کر کمانڈو چاقو کا درانتی دار پھل اس کی گردن پر رکھ دیا تھا۔ ٹیکم داس پر یہ حملہ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ وہ سنبھل بھی نہیں سکا تھا کہ وہ علی کمانڈو بوائے کی گرفت میں آ گیا تھا۔

علی نے پورے کمانڈو داؤ کے ساتھ ہندو قاتل ٹیکم داس کی گردن اِس طریقے سے دبوچ رکھی تھی کہ وہ آواز بھی نہ نکال سکتا تھا۔ اس کے علاوہ چاقو کا تیز درانتی دار پھل بھی ٹیکم داس کی گردن کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

علی نے مضبوط اور دِھیمی آواز میں کہا۔

"اگر ذرا آواز نکالی تو ایک سیکنڈ میں میرا چاقو تمہارے گلے کو کاٹ کر رکھ دے گا۔

ٹیکم داس کا جسم موت کے خوف سے ٹھنڈا پڑ گیا۔
اُس نے خرخراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"تم کون ہو؟ کیا —— کیا —— کیا چاہتے ہو؟"
"جس لڑکی کو تم لاہور سے شاہ جی کو قتل کرنے کے بعد اغوا کر کے لائے ہو، وہ کہاں ہے؟"
ٹیکم داس کے سامنے موت کھڑی تھی۔ اُس نے خشک بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔
"گنڈا سنگھ اُسے دِلی لے گیا ہے بیچنے کے لیے۔"
علی کے خون میں چنگاریاں پھوٹنے۔ اُس نے چاقو کے پھل کو ہندو قاتل کی گردن پر اور زیادہ دباتے ہوئے پُوچھا۔
"وہ دِلّی میں کہاں ملے گا؟"
ٹیکم داس بولا۔
"دریا کے پاس گاندھی نگر کے کونے والے مکان میں اُس نے شاہ جی کی بیٹی کو رکھا ہوا ہے۔ وہاں ہمارے ساتھی رہتے ہیں۔ اَب مجھے چھوڑ دو!"
علی نے ٹیکم داس کے کان میں غُراتے ہوئے کہا۔
"میں نے تمھیں چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا ٹیکم!

تم نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں۔جس شاہ جی کو تم نے اپنی گولی سے ہلاک کیا تھا، میں اُن کا بیٹا علی ہوں!"

ٹیکم داس کا خون پہلے ہی خشک ہو چکا تھا۔ یہ بات سُن کر اُس کی رہی سہی طاقت نے بھی جواب دے دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اُس کا آخری وقت آگیا ہے۔ گڑگڑانے لگا۔

"مجھے مت مارو! میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ سب کچھ گنڈا سنگھ ــــ گنڈا سنگھ کے کہنے پر ہوا تھا۔"

علی نے اِنتہائی نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"میں تم سب سے ایک ایک کر کے بدلہ لینے سرحد پار کر کے ہندوستان آیا ہوں۔ سب سے پہلے میں تم سے اپنے باپ کے قتل اور بہن کے اغوا کا اِنتقام لے رہا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے علی نے بجلی ایسی تیزی کے ساتھ ٹیکم داس کی گردن پر چاقو بھرپُور طاقت کے ساتھ پھیر دیا۔ چاقو کے پھرتے ہی علی نے ایک تجربہ کار کمانڈو کی طرح ٹیکم داس کو اپنے سے الگ کر دیا تاکہ اُس کی گردن سے نکلنے والے خون کا فوارہ اُس کے اپنے کپڑوں پر نہ پڑے۔ ہندو قاتل کی گردن آدھی سے زیادہ کمانڈو چاقو نے کاٹ ڈالی تھی۔

علی قریب ہی اندھیرے میں زمین پر بیٹھ گیا تھا اور اپنے باپ کے قاتل ٹیکم داس کی لاش کو تڑپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی گردن سے خون کا فوارہ اچھل رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا جسم کٹے ہوئے بکرے کی طرح ادھر سے اُدھر تڑپ رہا تھا۔ اُس کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکل رہی تھی۔ علی اپنے کمانڈو چاقو پر لگے ہوئے کافر کے خون کو گھاس سے پونچھ رہا تھا۔ اس کا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کے ایک قاتل سے اس کے خون کا بدلہ لے لیا تھا۔ اب دوسرے قاتل گنڈا سنگھ سے بدلہ لینا باقی تھا۔ اُسے ابھی اپنی بہن رُوبی کو بھی تلاش کرنا تھا۔

جب ٹیکم داس کی لاش ٹھنڈی ہو کر ساکت ہو گئی تو علی اس پر جُھک گیا۔ اس کی گردن سے ابھی تک سُرخ سُرخ خون آہستہ آہستہ اُبل رہا تھا۔ چاقو نے اس کی گردن کے سامنے والے سارے گوشت کو کاٹ ڈالا تھا۔ اور پیچھے سے گردن کی ہڈی بھی آدھی کٹ گئی تھی۔ ٹیکم داس کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

علی نے اُس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی ایک جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا جسے چلانے کا علی نے

اُسے موقع ہی نہ دیا تھا۔ دوسری جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکلی۔ علی کو آگے اِن روپوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اُس نے نوٹوں کی گڈی اپنی جیکٹ میں سنبھال کر رکھ لی۔ لاش کی چھوٹی جیب میں سے ایک چھوٹی سی پاکٹ بُک بھی نکلی۔ اِس پاکٹ بک کو بھی علی نے سنبھال کر رکھ لیا۔

اب اسے سمگلروں کے اس مکان میں جانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اسے یہ معلومات حاصل ہو گئی تھی کہ رُوبی کو گنڈا سنگھ نے دِلی میں اپنے ساتھی سمگلر کے اَڈے پر پہنچا دیا تھا۔ یہ اڈا بقول ٹیکم داس کے دریا پار والی بستی گاندھی نگر کے کونے والے مکان میں تھا۔

اِس کے باوجُود علی نے سوچا کہ مکان کی تلاشی لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اِس ہندو کافر نے جھوٹ بولا ہو اور اس مکان کے اندر ہی ہو۔ چنانچہ یہ سوچ کر علی اندھیرے میں سمگلروں کے مکان کی طرف بڑھا۔

مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ اُس نے پتھر کی ایک کنکر اُٹھا کر دروازے پر ماری جس کا ہلکا سا شور پیدا

ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اندر کوئی ہوگا تو وہ اِس آواز پر ضرور باہر آجائے گا۔ مگر اندر سے کوئی باہر نہ آیا۔ علی نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور سائیلنسر لگا پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ پھر سمگلروں کے مکان کے اندر داخل ہوگیا۔ مکان کے اندر ایک تہ خانہ تھا جس میں لالٹین جل رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کے بڑے بڑے بکس پڑے تھے۔

علی نے سارے مکان میں گھوم پھر کر دیکھا۔ وہاں نہ تو کوئی دوسرا اسمگلر تھا اور نہ ہی اِس کی بہن روبی تھی۔

علی مکان سے نکل آیا اور تیز تیز قدموں سے اپنے ہوٹل کی طرف چلنے لگا۔ اُس کا دل مطمئن تھا۔ اُس نے اپنے ڈیڈی کے ایک قاتل سے ان کے خون کا بدلہ لے لیا تھا۔

ہوٹل پر سناٹا طاری تھا۔ علی پچھلی طرف سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنی دوسری منزل والی کوٹھڑی میں آگیا۔ اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اس کی کوٹھڑی کی بتی جل رہی تھی۔ اُس نے جلدی سے جیب سے ہندو کافر کی جیب سے نکالی ہوئی نوٹوں کی گڈی باہر نکالی۔ یہ

پچاس روپے مالیت کی انڈین کرنسی کے نوٹوں کی گڈی
تھی۔ علی نے اسے گنا۔ یہ کل پانچ ہزار روپے تھے۔
علی کو ان کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ اُس نے نوٹوں کی
گڈی رومال میں لپیٹ کر اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب
میں سنبھال کر رکھ لی۔ پھر اُس نے ہندو سمگلر کی پاکٹ
بک نکال کر دیکھا۔ اُس پر کچھ حساب کتاب لکھا تھا۔
آخری صفحے پر دِلی گاندھی نگر کے سمگلروں کے خفیہ
اڈے کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ یہ ۱۲/۷ نمبر تھا۔ علی نے
اس نمبر کو زبانی یاد کرلیا۔ یہاں اس کی بہن روبی کو
پہنچایا گیا تھا۔

اَب علی کو ہوٹل میں نوکری کرنے کی ضرورت نہ
رہی تھی۔ اُس نے چاقو اور پستول دونوں جیکٹ کی
اندرونی جیبوں میں رکھے، کوٹھڑی کی بتّی بجھائی اور
آہستہ سے کوٹھڑی سے نکل کر سیڑھیاں اُتر کر نیچے
آگیا۔

ہوٹل کے آگے چھوٹی سڑک پر دُھند چھائی ہوئی
تھی۔ علی نے جموں شہر کو جانے والی سڑک پر چلنا
شروع کر دیا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔
بڑی سڑک پر آکر علی کو ایک ٹیکسی مِل گئی۔ وہ ٹیکسی

کے ذریعے جموں کے ریلوے اسٹیشن پر آگیا۔ اسٹیشن پر اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ اگر وہ اتنی رات گئے سڑک پر ہوتا تو گشتی پولیس اس سے پوچھ گچھ کر سکتی تھی۔

علی نے ایک قُلی سے پوچھا کہ یہاں سے دِلّی کے لیے کون سی گاڑی کب روانہ ہو گی؟

قلی نے کہا۔

"بابو صاحب! یہاں سے کوئی گاڑی سیدھی دِلّی نہیں جاتی۔ دو بجے یہاں سے ایک پسنجر ٹرین جالندھر جائے گی۔ وہاں سے آپ کو دِلّی جانے والی جنتا ایکسپریس مل جائے گی۔ ٹکٹ آپ یہیں سے جموں کا لے لیں۔"

علی نے قلی کو پیسے دے کر جموں سے دِلی تک کا سکینڈ کلاس کا ٹکٹ منگوایا۔ قُلی کو پانچ روپے انعام دے دیئے اور ٹرین کے پلیٹ فارم پر لگنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ گاڑی جموں ہی سے تیار ہو کر چلتی تھی۔ آدھ گھنٹے بعد ریل گاڑی پلیٹ فارم پر آکر لگ گئی۔

دوسرے مسافروں کے ساتھ علی بھی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ سکینڈ کلاس کا صرف ایک ہی ڈبہ تھا۔ وہ اس میں بیٹھ گیا۔

ڈبے میں کوئی دوسرا مسافر نہیں تھا۔ علی کے پاس کافی روپے تھے۔ اُس نے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ اِسی لیے لیا تھا کہ وہ دوسرے لوگوں کی نظروں سے بچا رہے گا۔

ٹھیک دو بجے ٹرین جالندھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ علی کچھ دیر تو جاگتا رہا۔ پھر ڈبے کی کھڑکیاں بند کر کے سو گیا۔ صبح کی روشنی پھیل رہی تھی کہ اس کی آنکھ کھُل گئی۔ ٹرین گورداسپور کے ریلوے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ علی نے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ ٹرین چل پڑی۔ دن کے آٹھ بجے گاڑی ہندوستان کے شہر جالندھر پہنچ گئی۔

علی ٹرین سے اُترا اور ایک ٹی سٹال پر کھڑے ہو کر ناشتہ کیا۔ اِسے پتہ چلا کہ جنتا ایکسپریس امرتسر سے آ رہی ہے اور تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گی۔ علی کی جیب میں کمانڈو چاقو کے علاوہ بھرا ہوا پستول اور کچھ میگزین بھی تھا۔ اگر کوئی اس کی تلاشی لے لیتا تو ان چیزوں کے برآمد ہونے پر اسے پکڑا جا سکتا تھا۔ چنانچہ علی وہیں سٹال پر ہی کھڑا چائے وغیرہ پیتا رہا۔ وہ اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر رہا تھا اور سٹال والے

کو اُس نے اپنا نام جے پرکاش بتایا تھا۔
آخر دِلی جانے والی جنتا ایکسپریس آگئی۔ وہ جلدی سے اس کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ ٹرین تھوڑی دیر کے لیے رُکی اور پھر دِلی کی طرف چل پڑی۔

علی اس سے پہلے ہندوستان کبھی نہیں آیا تھا۔ اُس نے دِلی شہر میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ پڑھا لکھا، بہادر اور تجربہ کار کمانڈو نوجوان تھا۔ دِلّی کے بارے میں اُس نے بہت کچھ پڑھا ہوا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ ہندوستان کا دارالحکومت ہے۔ یہاں اسٹیشن اور اِیئر پورٹ پر سیکورٹی کا بڑا سخت اِنتظام ہوتا ہے۔

علی کو خطرہ تھا کہ کوئی سی آئی ڈی والا اُس پر شک کر کے اُس کے پیچھے نہ لگ جائے۔ اسی لیے علی سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں آتے ہی اُوپر برتھ پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ ڈبے میں ایک سکھ بھی اپنے بال بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ علی نے اُس سے کوئی بات نہ کی اور برتھ پر لیٹتے ہی یہ ظاہر کیا جیسے وہ سو گیا ہے۔ ٹرین اب تیز رفتاری سے دِلی کی طرف جا رہی تھی۔

میرٹھ کے اسٹیشن پر ٹرین رُکی تو علی نے پلیٹ فارم پر اُتر کر ایک سٹال پر کھڑے ہو کر تھوڑا بہت کھانا کھایا، چائے پی اور پھر اپنے ڈبے میں چڑھ کر برتھ پر لیٹ گیا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے گاڑی دلی کے بہت بڑے پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔

رات ہو چکی تھی۔ اسٹیشن پر بڑی رونق تھی۔ خوب روشنیاں تھیں۔ علی نے ٹرین سے نکلنے سے پہلے اپنی جیکٹ کی جیبوں پر ہاتھ رکھ کر چیک کیا۔ اس کا کمانڈو چاقو، پستول اور نوٹوں کی گڈی اس کے پاس محفوظ تھی وہ دلی کے شہر میں پہلی بار آیا تھا۔ اسٹیشن کے باہر کافی رش تھا۔ موٹر گاڑیاں، تانگے اور رکشے کھڑے تھے۔ علی ایک رکشے میں سوار ہو گیا اور اُس نے ڈرائیور سے گاندھی نگر چلنے کو کہا۔

علی کو صرف ایک ہی خطرہ تھا کہ اگر اتفاق سے گنڈا سنگھ گاندھی نگر والے سمگلروں کے اڈے پر موجود ہوا تو وہ اُسے فوراً پہچان لے گا۔ کیونکہ گنڈا سنگھ نے علی کو ڈیڈی کے ساتھ دو تین بار دیکھا ہوا تھا علی نے فیصلہ کیا کہ وہ جونہی اچانک سمگلروں کے ۱۲/۷ نمبر والے مکان پر نہیں جائے گا۔ بلکہ پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش

کرے گا کہ گنڈا سنگھ تو وہاں پر نہیں ہے۔ اگرچہ اسے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ گنڈا سنگھ دلّی میں رُوبی کو اڈے پر پہنچا کر کسی دوسرے شہر کی طرف چلا گیا ہے۔ پھر بھی علی اپنی تسلّی کر لینا چاہتا تھا۔ رکشا رات کے وقت دلی کی جگمگاتی سڑکوں پر گاندھی نگر کی طرف جا رہا تھا۔ رکشا شہر کی بارونق سڑکوں سے باہر آ گیا۔ اب وہ ایک خاموش سڑک پر دوڑا جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک بستی کے باہر بس اسٹاپ کے پاس رُک گیا۔ رکشا ڈرائیور نے پوچھا۔

"بابو گاندھی نگر کہاں جانا ہے؟"

علی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں چلا جاؤں گا۔"

علی نے رکشے والے کو کرایہ دیا اور گاندھی نگر کی آبادی کی طرف دیکھا۔ یہ کافی بڑی آبادی تھی۔ مکانوں اور کوارٹروں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ علی بستی کے کونے والے مکان کی تلاش میں تھا۔ وہ بستی کی طرف چلا اور کونے والی گلی میں جو دکان تھی وہاں آ کر رُک گیا۔ یہ پان سگریٹ والے کی دکان تھی۔ علی نے دکان دار کو مکان کا نمبر بتایا اور پوچھا کہ یہ مکان کہاں پر ہے؟

پان سگریٹ والے نے علی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"بابوجی! یہ مکان تو سامنے والا ہی ہے مگر اس میں جو لوگ رہتے ہیں وہ مکان خالی کر کے آج صبح ہی یہاں سے چلے گئے ہیں۔"

علی پریشان ہو گیا۔

"وہ ـــــ وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ کچھ آپ کو معلوم ہے؟"

دکان دار بولا۔

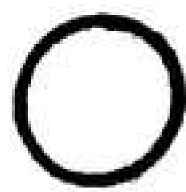
"بابوجی! ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ان لوگوں کی محلے میں شہرت اچھی نہیں تھی۔ محلے والوں نے پولیس کو بڑی شکایتیں کی تھیں کہ اس مکان میں جُوا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ صبح مکان چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ بھی ان کے بارے میں زیادہ کسی سے نہ پوچھیں۔ لوگ آپ پر بھی شک کریں گے۔ آپ مجھے شکل سے شریف نوجوان لگتے ہیں۔"

علی نے خیریت اسی میں سمجھی کہ وہاں سے چلا جائے وہ جلدی سے بڑی سڑک پر آگیا۔ بس سٹاپ پر آکر وہ سوچنے لگا کہ اب وہ کیا کرے؟ رُوبی کو کہاں تلاش کرے۔ جن لوگوں سے اپنی بہن روبی کے بارے میں کچھ پتہ چل سکتا تھا وہ تو یہاں سے فرار ہو گئے ہیں۔ اب وہ

کیا کرے! کدھر جائے؟

روپے علی کے پاس موجود تھے یہ بھی بڑی غنیمت کی بات تھی۔ ورنہ اس کے پاس روپے نہ ہوتے تو اُسے بڑی مصیبت پڑ سکتی تھی۔ علی نے یہی سوچا کہ وہ رات کہیں قریب ہی کسی ہوٹل میں ٹھہر جائے اور صبح کو یہاں آ کر کسی دوسرے شخص سے سمگلروں کے بارے میں دریافت کرنے کی کوشش کرے گا۔

وہ گاندھی نگر آبادی کے دوسری طرف آگیا۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک چار منزلہ ہوٹل تھا۔ علی نے اس ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا اور کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ صبح اُسے کس جگہ سے رُوبی کے بارے میں پوچھ گچھ کرنی چاہیے۔ یونہی خواہ مخواہ کسی سے بات کرنے پر اُس پر بھی شک کیا جا سکتا تھا۔ علی نے کھانا کمرے میں ہی منگوا کر کھایا اور اپنا پستول، روپے اور کمانڈو چاقو اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر کمرے کی اندر سے کُنڈی لگا کر سو گیا۔



سانپوں والی کوٹھڑی

دوسرے دن علی ناشتہ کر کے ہوٹل سے نکلا اور گاندھی نگر آ گیا۔ اس نے بستی میں چل پھر کر بہت سے لوگوں سے سمگلروں کے مکان کے بارے میں پوچھا۔ ہر ایک نے یہی بتایا کہ وہاں کچھ بدمعاش قسم کے لوگ رہتے تھے جن کو محلے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس لیے لوگوں نے انہیں یہاں سے نکال دیا ہے۔ علی مایوس ہو کر اپنے ہوٹل کے کمرے میں واپس آ گیا۔ وہ لوگوں سے زیادہ پوچھ گچھ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ خود بغیر پاسپورٹ ویزے کے ہندوستان میں غیر قانونی طور پر داخل ہوا تھا اور پکڑے جانے پر قید میں ڈال دیا جاتا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس پستول تھا، کمانڈو چاقو تھا۔ یہ چیزیں علی کو گرفتار کروا سکتی تھیں۔ علی سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے

اپنی بہن رُوبی کو کہاں تلاش کرنا چاہیے۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ دلّی اس کے لیے ایک بالکل نیا شہر تھا۔ وہ کہاں جائے؟ کہاں رُوبی کو تلاش کرے؟ علی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔

آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اُسے اس گاندھی نگر کے علاقے سے نکل جانا چاہیے کیونکہ یہاں اس پر شک کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے دن علی نے ہوٹل میں اپنا بل ادا کیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور سے کہا۔

"جامع مسجد لے چلو۔"

علی نے سُن رکھا تھا کہ جامع مسجد کے ارد گرد مسلمانوں کی آبادی ہے۔ علی زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی میں رہنا چاہتا تھا۔ جامع مسجد کے پاس آکر علی نے رکشہ چھوڑ دیا اور سامنے والی عمارتوں کی طرف چلنے لگا۔ سڑک پر کافی رش تھا۔ یہاں مسلمان زیادہ نظر آرہے تھے۔

علی نے آخر ایک درمیانے قسم کا مسلمانوں کا ہوٹل تلاش کر لیا جو جامع مسجد کے پیچھے سڑک کے کنارے پر تھا۔ علی نے یوں ایک کمرہ لے لیا۔ دوپہر کو اس نے کمرے میں ہی کھانا منگوا کر کھایا۔ پھر ہوٹل سے نکل

کر بازار میں آگیا۔ ایک دکان سے علی نے اپنے لیے نئی پتلون، نئی جیکٹ قمیض، جرابیں اور ایک سویٹر خریدا۔ روپے اس کے پاس کافی تھے۔ ہوٹل واپس آکر علی نے غسل کیا۔ نئے کپڑے پہنے۔ نئی جیکٹ پہنی۔ وہ چاقو اور پستول اپنے پاس ہی رکھتا تھا اس نے اپنے چہرے پر ایک تبدیلی کی تھی۔ وہ یہ کہ اس نے شیو بنانی چھوڑ دی تھی۔ ابھی علی کی عمر زیادہ نہ تھی اور اسے داڑھی بھر کر نہیں آئی تھی۔ پھر بھی جب اس نے شیو کرنی چھوڑ دی تو اس کی داڑھی اور مونچھیں بڑھنے لگی تھیں۔ یہ وہ صرف اس لیے کر رہا تھا کہ اس کے ڈیڈی کا دوسرا قاتل اور اس کی بہن کو اغوا کرنے والا گنڈا سنگھ اسے آسانی سے اور جلدی سے نہ پہچان سکے۔

علی جامع مسجد کے بازاروں میں کافی دیر تک گھومتا رہا۔ شام کو وہ واپس ہوٹل آگیا۔ اب اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ کچھ دن اسی ہوٹل میں رہ کر شہر کے مختلف علاقوں میں اپنی بہن روبی کو تلاش کرے گا۔ اگر پھر بھی وہ اسے کہیں نہ ملی تو پھر وہ واپس جموں جا کر سمگلروں کے اڈے سے یہ معلوم کرنے کی

کوشش کرے گا کہ گنڈا سنگھ سمگلر کہاں ہے تا کہ وہ اُسے پکڑ کر رُوبی کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔

جس وقت علی جامع مسجد دِلی کے ہوٹل میں رَہ رہا تھا اس وقت اس کی چھوٹی بہن رُوبی وہاں سے دُور اِسی شہر کی ایک ویران شکستہ کوٹھی کے تہہ خانہ میں قید تھی اور چمپا بائی اسے زبردستی ڈانسر بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پہلے دو دن تو چمپا بائی نے رُوبی کو کچھ نہ کہا اور اس کی خاطر مدارات کرتی رہی۔ آخر بہت جلد رُوبی پر یہ راز کھل گیا کہ چمپا بائی مسلمان نہیں بلکہ ہندو اور ایک بدنام عورت ہے اور اب اُسے طوائف اور ڈانسر بنا کر اپنے کوٹھے پر نچوانا چاہتی ہے۔ رُوبی نے دل میں طے کر لیا کہ وہ خودکشی کر لے گی مگر اپنی عزّت کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گی۔

چمپا بائی کے باڈی گارڈ بدمعاش کانتی اور سریا نے رُوبی پر ظلم کرنا شروع کر دیا۔ رُوبی کو روزانہ دن میں دو تین بار ہنٹروں سے مارا جاتا۔ رُوبی کے بدن پر نیل پڑ گئے تھے۔ مگر وہ یہی کہتی کہ میں مَر جاؤں گی مگر طوائف نہیں بنوں گی۔

جب تین چار روز گزر گئے اور رُوبی اِنکار کرتی رہی

تو بدمعاش کانتی اور ہریا نے چمپا بائی کو مشورہ دیا کہ یہ لڑکی ضدی ہے۔ اِسے آگے بیچ دینا چاہیے۔ چمپا بائی نے دونوں بدمعاشوں کو بُرا بھلا کہا اور بولا۔

"میں اِس خوب صورت لڑکی کو ہاتھ سے جانے نہیں دوں گی۔ ایسی لڑکی مجھے اِتنی سستی قیمت پر پھر کہیں سے نہیں ملے گی۔ میں اسے ڈانسر بنا کر ہی رہوں گی۔

بدمعاش کانتی نے کہا۔

"تو پھر تم کیا کرو گی؟ یہ لڑکی کہیں خودکشی نہ کرلے۔"

چمپا بائی کہنے لگی۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس لڑکی رُوپی کو گوالیار کے جنگل میں جو ہمارا خفیہ ٹھکانہ ہے وہاں پہنچا دیا جائے۔ وہاں ہماری خاص سانپوں والی کوٹھڑی ہے ایک ہی دن میں سانپوں کے پاس رہنے سے اس لڑکی کا دماغ درست ہو جائے گا اور خود ہی ڈانسر بننے پر راضی ہو جائے گی۔"

ہریا بدمعاش بولا۔

"چمپا بائی! یہ تم نے بالکل ٹھیک سوچا ہے۔ گوالیار کے جنگل والے ٹھکانے پر ہمارا اپنا آدمی

کالیا موجود ہے۔ میں بھی وہاں اس کے پاس ہی رہوں گا۔ سانپوں والی کوٹھڑی میں رہ کر ایک ہی دن میں اس لڑکی کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

چمپا بائی نے ہریا سے کہا۔

"تم اس لڑکی کے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ رُوبی کے ساتھ کانتی جائے گی۔ وہ تم سے زیادہ تجربہ کار اور ظالم بدمعاش ہے۔"

پھر چمپا بائی نے کانتی بدمعاش کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کانتی لال! تم آج شام کو ہی رُوبی کو لے کر گوالیار کے جنگل والے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ جو لڑکیاں میری راہ پر چلنے سے انکار کرتی ہیں اُن کا دماغ سانپوں والی کوٹھڑی میں جاتے ہی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ چلو تم تیاری کرو۔ اور سُنو! رُوبی کو بے ہوشی کا انجکشن تم ہی لگاؤ گے۔"

کانتی بدمعاش نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"تم بالکل فکر نہ کرو چمپا بائی! میں رُوبی کو لے کر جنگل والے ٹھکانے میں آج راتوں رات ہی پہنچ جاؤں گا۔ بھگوان نے چاہا تو بہت جلد رُوبی کو اس حالت

میں لے کر آؤں گا کہ وہ تمہیں آکر خود کہے گی کہ میں ڈانسر بننے کو تیار ہوں۔"

چمپا بائی نے خوش ہو کر کہا۔

شاباش! مجھے تم سے یہی امید ہے۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں بہت بڑا انعام دوں گی۔"

رُوبی کو کچھ خبر نہ تھی کہ اسے ایک بھیانک جنگل کی سانپوں والی کوٹھڑی میں بھیجا جا رہا ہے۔ اس پر بڑے ظلم ہو رہے تھے۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ اب تو اس کے آنسو بھی ختم ہو گئے تھے۔ وہ بار بار اپنے بھائی علی کو یاد کر رہی تھی کہ وہ اس کی مدد کو کیوں نہیں آ رہا۔ وہ اسے وہاں آ کر ظالم کافروں کے پھندے سے چھڑا کر کیوں لے جاتا نہیں۔ اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ اس کا پیارا بھائی علی اسی شہر میں، اس کے تہ خانے سے تھوڑی دور ایک ہوٹل میں پڑا اسے یاد کر رہا ہے۔ اور اس کی تلاش میں دن بھر دیوانوں کی طرح شہر میں پھر تا رہا ہے۔

اس رات رُوبی کو دونوں بدمعاشوں سریا اور کانتی نے پکڑ کر زبردستی بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا۔

رُوبی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر انھوں نے ٹیکہ لگا دیا اور روبی بے ہوش ہوگئی۔

اسی وقت بدمعاش کانتی نے رُوبی کو کپڑے میں بوری کی طرح لپیٹا، بند ویگن میں ڈالا اور دِلی سے گوالیار جانے والی سڑک پر روانہ ہوگیا۔ صبح ابھی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی رات کا اندھیرا باقی تھا کہ کانتی بدمعاش بے ہوش رُوبی کو لے کر گوالیار شہر کی بڑی سڑک پر پہنچ گیا۔ یہاں سے ایک سڑک کھیتوں کے بیچ سے ہوتی ہوئی گھنے جنگل کو جاتی تھی۔ یہ ہندوستان کا بڑا خطرناک جنگل تھا۔

اِس جنگل میں زہریلے سانپ، خونخوار درندے اور خوف ناک شیر رہتے تھے۔ اِس جنگل میں ایسی دلدلیں بھی تھیں کہ جن میں اگر ہاتھی گر پڑے تو دلدل اِسے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں سالم کا سالم نگل جاتی تھی۔ اور ہاتھی کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا تھا۔ اسی جنگل میں چمپا بائی نے اپنا ایک خفیہ اڈا تیار کیا تھا۔ یہاں اس کا ایک بدمعاش پرکاش رہتا تھا۔ یہاں ایک کوٹھڑی تھی جس میں سانپ جالی دار پنجروں میں بند رکھے ہوئے تھے۔ ان سانپوں کے دانت نکال دیئے گئے تھے

جس کی وجہ سے وہ کسی کو ڈس کر ہلاک نہیں کر سکتے تھے لیکن دیکھنے والے کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ جو عورت یا لڑکی چمپا بائی کا کہا نہیں مانتی تھی وہ اُسے دو چار دن کے لیے سانپوں والی کوٹھڑی میں بند کر دیتی تھی۔ سانپوں کو دن میں ایک دو بار کھول دیا جاتا تھا۔ جب سانپ عورت کے جسم پر رینگتے تو وہ چیخ مار کر باہر کو دوڑتی مگر دروازہ بند ہوتا۔ پھر وہ عورت بے چاری موت کے خوف سے چمپا بائی کا کہا مان لیتی اور اس کے کوٹھے پر ڈانس کرنا شروع کر دیتی تھی۔

رُوبی کو بھی اسی مقصد کے لیے سانپوں والی کوٹھڑی میں بند کرنے کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ کانتی بدمعاش جنگل میں ویگن لیے چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ ویگن کا راستہ بند ہو گیا۔ یہاں سے کانتی بدمعاش نے روبی کو اپنے کاندھے پر اٹھایا اور رات کے اندھیرے میں جنگل میں چلنے لگا۔ اِسے اندھیرے میں بھی راستے کا پتہ تھا۔

جب وہ جنگل میں چھوٹے سے ٹیلے کے دامن میں اپنے خفیہ اڈے پر پہنچا تو سورج جنگل میں نکل رہا تھا اور دن کی ہلکی گلابی روشنی گھنے درختوں میں سے

چھن چھن کر اونچی اونچی گھاس پر پڑ رہی تھی۔ ٹیلے کے نیچے خفیہ اڈے پر موجود بدمعاش پرکاش نے کانتی بدمعاش کو آتے دیکھ لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ کسی عورت کو سانپوں والی کوٹھڑی میں بند کرنے لا رہا ہے۔ وہ ایک منزلہ پرانے خستہ مکان سے باہر آ گیا۔

کانتی بدمعاش کانپ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"پرکاش! اسے ابھی اندر لٹا دو۔ ہوش آئے گا تو اسے سانپوں والی کوٹھڑی میں بند کرتا ہے۔"

پرکاش بے ہوش روبی کو کاندھے پر اٹھا کر مکان کے کمرے میں لے گیا اور اسے چارپائی پر ڈال کر باہر آ گیا۔ کانتی بدمعاش باہر بنچ پر بیٹھا گھڑے سے پانی نکال نکال کر پی رہا تھا۔ پرکاش نے کہا۔

"یہ لڑکی کتنے میں خریدی ہے چمپا بائی نے؟"

کانتی بدمعاش بولا۔

"چمپا بائی نے بیس ہزار روپے میں خریدی ہے یہ لڑکی! اس کا نام روبی ہے۔ کہتے ہیں یہ مسلمان ہے۔ میرا خیال ہے گنڈا سنگھ اسے پاکستان سے اغوا کر کے لایا ہے۔"

پرکاش نے کہا۔

"وہیں سے لایا ہو گا۔ لڑکی اچھی ہے۔ اگر چمپا بائی کے کوٹھے پر یہ مجرا ڈانس کرنے لگے تو چمپا بائی کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

کانتی کہنے لگا۔

"ہمیں بھی تو انعام ملے گا۔ بس اسے ہوش آ جائے تو سانپوں والی کوٹھڑی میں اسے بند کر دیں گے میرا خیال ہے یہ ایک ہی منٹ میں ہتھیار پھینک دے گی۔ لاؤ چائے پلاؤ اور کچھ کھلاؤ۔"

پرکاش بدمعاش نے چولہا جلایا اور روٹی اور چائے تیار کرنے لگا۔

رُوبی مکان کے کمرے میں اب بے ہوش نہیں تھی۔ وہ ہوش میں تھی اور اُس نے دونوں بدمعاشوں کی گفتگو سُن لی تھی۔ وہ یہ سُن کر خوف سے لرز اٹھی کہ اسے سانپوں کی کوٹھڑی میں بند کیا جا رہا ہے۔ وہ ہاتھ باندھ کر خدا کے حضور دعا مانگنے لگی کہ اے اللہ! مجھے ان ظالموں سے بچا لے! مجھے میرے بھائی کے پاس پہنچا دے!

رُوبی نے اُٹھ کر کمرے کی کھڑکی کھولنا چاہی مگر کھڑکی باہر سے بند تھی۔ اُس نے کھڑکی کی دراز میں سے جھانک کر دیکھا۔ باہر اسے دن کی روشنی میں گھنا جنگل دکھائی دیا۔

وہ سمجھ گئی کہ اِسے دِلّی شہر سے نکال کر یہاں کسی ویران جنگل میں پہنچا دیا گیا ہے اور اب اسے سانپوں والی کوٹھڑی میں بند کیا جانے والا ہے۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر اپنے بھائی علی کو یاد کر کے رونے لگی۔ اس کے بعد اُس نے ایک بار پھر خدا سے اپنی سلامتی کی دعا مانگی۔

روبی نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے اَللّٰہ کے حضور دعا مانگ رہی تھی کہ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی آنکھ لگ گئی ہے۔ وہ سو گئی ہے۔ پھر اُسے اپنے سامنے نیلی روشنی نظر آئی۔ اُس نیلی روشنی میں ایک سفید نورانی شکل نمودار ہوئی۔ اس نورانی شکل کے ماتھے سے نُور کی کرنیں پھُوٹ رہی تھیں۔ اچانک رُوبی کے کانوں میں شفقت بھری نرم اور محبت بھری آواز سُنائی دی۔

"اللّٰہ پر بھروسہ رکھو بیٹی! جن سانپوں کی کوٹھڑی میں تجھے بند کیا جائے گا اُن سانپوں میں زہر نہیں ہے۔ اُن سانپوں کے دانت نکال دیئے گئے ہیں۔ وہ تجھے ڈس نہیں سکیں گے۔ گھبراؤ نہیں بیٹی! اللّٰہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ تیرا بھائی علی بھی تیرے پاس ضرور آ سکے گا۔"

رُوبی نے نُورانی صورت والے بزرگ کی آواز صاف سُنی تھی۔ وہ اُس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر اُس کی آواز نہ نکل سکی۔ پھر نُورانی شکل غائب ہو گئی اور روبی کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

اُسے بڑا حوصلہ ہوا کہ اَللہ اُس کی حفاظت کر رہا ہے اور ایک نورانی بزرگ اُس کے ساتھ ہیں۔ اسے یہ سن کر بھی بڑا اطمینان ہوا کہ جن سانپوں کی کوٹھڑی میں اُسے بند کیا جا رہا ہے ان میں زہر نہیں ہے۔

کوٹھڑی میں دن کی ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ اِتنے میں دروازہ کھُلا۔ کانتی اور پرکاش بدمعاش دونوں اندر آ گئے۔ کانتی بدمعاش کے ہاتھ میں روٹیوں کی پلیٹ تھی پرکاش نے پانی کا مٹی کا کٹورہ پکڑ رکھا تھا۔ کانتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا کہ تمہیں ہوش آ گیا۔ لو، روٹی کھاؤ!"

وہ روٹی اور پانی اندر رکھ کر چلے گئے۔ رُوبی کا دل تو بالکل نہیں چاہتا تھا مگر اُسے زندہ بھی رہنا تھا۔ اپنے بھائی علی کے لیے زندہ رہنا تھا۔ نورانی شکل والے بزرگ نے اُسے خوش خبری دی تھی کہ اس کا بھائی علی اُس کے پاس ضرور آئے گا۔ اب رُوبی زندہ رہنا چاہتی

تھی۔ ہر حالت میں زندہ رہنا چاہتی تھی۔
روٹی مکئی کی تھی اور اس کے اُوپر آم کا اچار رکھا ہوا تھا۔ روبی نے روٹی کھاکر پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔
دوپہر کو بھی کانتی بدمعاش نے اسے روٹی لاکر دی اور باہر چلا گیا۔ پھر شام کو وہ روبی کے پاس لالٹین لے کر آیا۔ لالٹین روشن کرکے اُس نے کیل کے ساتھ لٹکا دی اور بولا۔
"رُوبی! تمہیں یہاں اِس لیے لایا گیا ہے کہ تمہیں سانپوں والی کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے۔ اگر اب بھی تم مان جاؤ اور چمپا بائی کے کوٹھے پر ناچنے کے لیے راضی ہو جاؤ تو تمہیں سانپوں والی کوٹھڑی میں بند نہیں کیا جائے گا۔"
رُوبی نے نفرت سے کہا۔
"مَیں مرنا پسند کروں گی مگر طوائف بن کر کوٹھے پر ڈانس نہیں کروں گی۔"
کانتی بدمعاش نے رُوبی کو زور سے تھپڑ مارا۔ رُوبی پیچھے گر پڑی۔ کانتی بدمعاش غصے میں گرجا۔
"تو کیا تمہارا باپ بھی چمپا بائی کے کوٹھے پر مُجرا کرے گا۔ جب سانپ تجھے کاٹیں گے تو اپنے آپ کہو گی کہ

میں ڈانس کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے یہاں سے نکالو۔"

رُوبی کو بھی سخت غصہ آ گیا۔ اُس نے نفرت سے کہا۔

"تم لوگ مجھے بھُو کے شیروں کے آگے بھی ڈال دو گے تو میں تمہاری بات کبھی نہیں مانوں گی۔"

کانتی بدمعاش نے چلا کر پرکاش کو آواز دی۔

"پرکاش! سانپوں والی کوٹھڑی کو کھول دو۔"

پرکاش نے باہر سے جواب دیا۔

"کانتی! میں نے کوٹھڑی پہلے ہی کھول دی ہے۔ سانپ تمہاری روبی کا بے تابی سے اِنتظار کر رہے ہیں۔"

کانتی بدمعاش نے روبی کو بازو سے پکڑ کر باہر گھسیٹا اور اسے گھسیٹتا ہوا مکان کے نیچے تہ خانے میں لے گیا۔ یہاں سانپوں والی کوٹھڑی کا دروازہ کھُلا تھا۔ اندر جالی دار پنجروں میں بے شمار نیلے، کالے اور لسواری سانپ پھن اُٹھائے پھُنکار رہے تھے۔ اندر لالٹین جل رہی تھی۔ روبی کو کانتی بدمعاش نے کوٹھڑی میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

"اب دروازہ اُس وقت کھُلے گا جب تُو خود کہے گی کہ میں ڈانس کرنے پر تیار ہوں۔ مجھے باہر نکالو۔"

رُوبی نے لالٹین کے قریب روشنی میں دیوار کے

ساتھ لگی جالی دار الماری میں ساٹھ ستر کے قریب سانپ
پھن اٹھائے رینگتے اور پھنکارتے ہوئے دیکھے جو روبی
کی طرف اپنی زبانیں نکالے لال لال آنکھوں سے گھور
رہے تھے۔ رُوبی کی تو جان ہوا ہو گئی۔ حلق خشک ہو گیا۔
اگرچہ نورانی بزرگ نے اُسے بشارت دی تھی کہ یہ سانپ
اُسے کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ لیکن اس کے باوجود سانپ
کی بڑی دہشت ہوتی ہے۔ رُوبی کے دل میں یہ بھی شک
ہونے لگا کہ شاید اس نے یونہی کوئی خواب دیکھا ہو
اور یہ سارے سانپ زہریلے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی
رُوبی کے دل میں ایک خیال یہ بھی پیدا ہو گیا کہ ٹھیک
ہے، طوائف بن کر ناچنے اور گناہ کی زندگی بسر کرنے
سے بہتر ہے کہ مجھے سانپ کاٹ لیں اور میں مر جاؤں"۔
وہ کوٹھڑی کی دیوار سے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس
کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آرہی تھی کہ یہ سانپ
تو جالی دار الماری میں بند ہیں۔ یہ یہاں سے باہر کیسے
نکلیں گے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اِس الماری کے
کُنڈے سے جو رسّی بندھی ہوئی ہے اس کا ایک سِرا
نالی میں باہر نکلا ہوا ہے۔ یہ سرا کانتی بدمعاش کے
ہاتھ میں تھا۔

کوٹھڑی کا دروازہ بند کرنے کے چند سیکنڈ بعد کاتی بدمعاش نے رسی کو زور سے کھینچ دیا۔ رسی کے کھنچتے ہی سانپوں والی الماری کا دروازہ کھل گیا اور سانپ پھنکارتے ہوئے باہر نکل آئے۔ روبی کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ وہ اٹھ کر بھاگنے لگی لیکن اُس کے جسم سے جیسے خوف کے مارے جان نکل گئی تھی۔ وہ اُٹھ کر بھاگنے لگی مگر اسی جگہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ سانپ لالٹین کی روشنی میں فرش پر رینگتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ کسی نے اس کے پاؤں، کسی نے اس کی ٹانگیں، کسی نے اس کے بازو اور کسی نے اس کی گردن کو ڈس لیا مگر اُن میں سے کسی ایک میں بھی زہر نہیں تھا۔ دانت بھی نہیں تھے۔

لیکن رُوبی دہشت کے مارے غش کھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد اُسے جب ہوش آیا تو سارے کے سارے سانپ اُس کے قریب دو تین فٹ کے فاصلے پر کنڈلیاں مار کر بیٹھے اس کی طرف تک رہے تھے۔ اس کرشمے پر رُوبی حیران ہو کر رہ گئی۔ سب سے پہلے ہوش میں آتے ہی اپنے آپ کو دیکھا۔ وہ زندہ تھی! نورانی شکل والے بزرگ نے ٹھیک کہا تھا کہ اِن سانپوں

کے دانت نہیں تھے۔ اس لیے رُوبی کے جسم پر کہیں کسی سانپ کے دانتوں کا نشان نہیں پڑا تھا۔

اِس خیال سے رُوبی کے اندر زندہ رہنے کی زبردست طاقت آ گئی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اگر اس نے ہمت نہ ہاری، اپنی شکست کو تسلیم نہ کیا، گناہ کی طاقتوں کے آگے ہتھیار نہ ڈالے تو وہ نہ صرف زندہ رہے گی، بلکہ ایک مثالی لڑکی بن کر اُبھرے گی اور اپنے دشمنوں سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ بھی لے سکے گی۔

رُوبی کے خُون میں جیسے ایک بجلی سی دوڑنے لگی۔ مگر اس نے اپنی اس نئی طاقت اور نئے جذبے کو اپنے قابو میں رکھا۔ کیونکہ اُسے وہاں سے فرار بھی ہونا تھا۔ رُوبی کے دل میں یہ بات پتھر پر لکیر کی طرح بیٹھ گئی تھی کہ خدا اس کے ساتھ ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی اسے ہمت اور بہادری سے کام لینا ہو گا۔ کیونکہ خدا بھی اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد خود آپ کرتے ہیں۔ جو لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اُن کی خدا بھی مدد نہیں کرتا۔

رُوبی اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اُس نے وہاں سے نکلنے کی خاطر جھوٹ موٹ یہ کہہ بھی دیا کہ وہ چھپا بائی کا

کہا ماننے پر تیار ہے تو اُسے بے ہوش کر کے واپس چھپایا
کے تہ خانے میں دِلّی لے جایا جائے گا اور یوں رُوبی راستے
میں فرار ہونے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کر سکے گی۔ رُوبی
نے پکّا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ وہاں سے فرار ہو کر رہے
گی آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

اِس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ کسی طرح سے اِس
جنگل والے مکان میں رہے کیونکہ کسی نہ کسی ترکیب سے
اسے فرار ہونے کا موقع مل سکتا تھا۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کوٹھڑی کا دروازہ
تھوڑا سا کھلا۔ باہر کانتی موجود تھا۔ اُس نے بلند آواز
میں پوچھا۔

"کیوں لڑکی! کیا اِرادے ہیں؟ ہماری بات مانتی
ہے کہ نہیں؟"

رُوبی نے گرج کر کہا۔

"میں مسلمان ہوں اور مسلمان گناہ کی زندگی پر موت
کو زیادہ اچھا سمجھتے ہیں۔ میں تمہاری بات کبھی نہیں
مانوں گی۔ میں نیک ماں باپ کی اولاد ہوں۔ مر جاؤں
گی مگر گناہ نہیں کروں گی۔"

کانتی نے غصّے سے کہا۔

"تو پھر سانپوں میں ہی بیٹھی رہ!"

کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ جب سے رُوبی نے خواب میں بزرگ کی نورانی شکل دیکھی تھی اور ان کی شفقت بھری آواز سُنی تھی، اُس کے دل میں ایمان کا جذبہ بڑی شدت سے بیدار ہو گیا تھا۔ اس کے بدن میں ایک زبردست طاقت آگئی تھی۔ اس کا اللہ پر ایمان پختہ ہو گیا تھا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اگر اس نے اپنی مدد آپ کی تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا اور یہ کہ اسے کسی حالت میں بھی کمزور یا مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ اُس پر ایک بھاری مصیبت آن پڑی ہے۔ لیکن اسے اپنے ارادوں میں فولاد کی طاقت پیدا کر کے اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے غم کے بادلوں کو پھاڑ کر ایک نیک، بہادر اور سچی پاکستانی لڑکی بن کر باہر نکلنا ہو گا۔

جب انسان کا اللہ پر یقین پکا ہو جاتا ہے اور وہ وہ اپنے دل سے بُرے اور مایوس خیالات کو نکال کر باہر پھینک دیتا ہے تو اس کی آنکھوں میں خود بخود ایک خاص چمک اور زبردست چمک پیدا ہو جاتی ہے ایسا انسان جب کسی سے بات کرتا ہے تو دوسرے پر اس کی باتوں کا بہت اثر ہوتا ہے کیونکہ نیکی میں بہت

طاقت ہوتی ہے۔

رُوبی کا دل پہلے ہی بڑا پاکیزہ اور نیک تھا۔ اب جب نورانی شکل اس کے خواب میں آئی تھی تو اس کے پاکیزہ دل میں بے پناہ طاقت اور حوصلہ آگیا تھا۔ روبی کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر اس کے راستے میں بُرائی کا پہاڑ بھی آجائے تو وہ اس سے ٹکرا کر اسے ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔

دوسری طرف کانتی بدمعاش نے جب دیکھا کہ رُوبی کسی طرح بھی اُن کے راستے پر نہیں آتی تو اس نے رُوبی کو پرکاش غنڈے کے حوالے کیا اور خود واپس چمپا بائی کے پاس دِلّی آگیا۔ اُس نے چمپا بائی کو بتایا کہ رُوبی تو اپنی جگہ پر چٹان کی طرح اَڑ گئی ہے۔ وہ مر جائے گی مگر بُرائی کے راستے پر نہیں آئے گی۔ اِس پر چمپا بائی کو غصّہ آگیا۔ اُس نے کہا۔

"تو میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جا کر رُوبی کو جنگل والی خونخوار آدم خور شیرنی کے غار میں پھینک آؤ تاکہ شیرنی اُسے کھا جائے۔ میں اب اسے زندہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ جاؤ!"

کانتی بدمعاش اسی روز واپس جنگل والے خفیہ ٹھکانے

پر پہنچ گیا۔ آتے ہی اُس نے غُنڈے پرکاش کو بتایا کہ روبی کو آج شام کے وقت آدم خور شیرنی کے غار میں پھینکنا ہے۔ پرکاش بولا۔

"ٹھیک ہے! آدم خور شیرنی دن بھر جنگل میں پھرتی ہے۔ شام کے بعد اپنے غار میں آتی ہے۔ جب وہ اپنے غار میں ایک اِنسان کو دیکھے گی تو اُسی وقت اسے ہڑپ کر جائے گی۔"

رُوبی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ سانپوں والی کوٹھڑی میں بند پڑی تھی۔ سانپ اب اس سے مانوس ہو گئے تھے۔ لگتا تھا کہ سانپوں پر بھی روبی کی نیک رُوح اور پاکیزہ خیالات کا اثر ہو گیا تھا۔ وہ سارا دن اس کے اِرد گرد پیار سے منڈلاتے پھرتے تھے۔ رُوبی کو بھی اُن سے ذرا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔

جب دن ڈوب گیا اور جنگل میں شام کے سائے بڑھنے لگے تو پرکاش اور کانتی بدمعاش دونوں کوٹھڑی میں آئے اُنھوں نے روبی کے منہ پر کپڑا لپیٹا اور اسے اٹھا کر جنگل کی طرف چل پڑے۔ رُوبی سمجھ گئی کہ یہ لوگ اسے قتل کرنے کے لیے لے جا رہے ہیں۔ وہ خدا سے اپنی زندگی کی دعائیں مانگنے لگی۔ اِسے بار بار اپنے بھائی علی کا بھی خیال آ

رہا تھا کہ خدا جانے وہ کہاں ہوگا اور اسے اپنی بہن کی موت کی کبھی خبر بھی ملے گی یا نہیں۔ کانتی اور بدمعاش جنگل کے اندر ایک چٹان کے پاس آ کر رُک گئے۔ پرکاش نے کہا۔

"یہی آدم خور شیرنی کی غار ہے۔"

اب ساری بات رُوبی کی سمجھ میں آگئی تھی۔ یہ لوگ اُسے کسی آدم خور شیرنی کے غار میں پھینکنے آئے تھے۔ چٹان میں ایک قدرتی غار بنا ہوا تھا۔ کانتی بدمعاش نے کہا۔

"شیرنی کہیں اندر تو نہیں ہے؟"

پرکاش بولا۔

"اگر شیرنی اندر ہوتی تو آدمی کی بُو پا کر وہ فوراً باہر آ جاتی۔ بس وہ آنے ہی والی ہوگی۔ اِس مُصیبت کو غار میں پھینک کر یہاں سے بھاگو۔"

انھوں نے رُوبی کو غار کے اندر لے جا کر اس کے پاؤں میں رسّی ڈال کر رسی ایک بھاری پتھر کے ساتھ باندھ دی۔ پھر اُس کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے تاکہ وہ رسّی نہ کھول سکے اور تیزی سے باہر نکل گئے۔

اِن ظالم آدمیوں کے جانے کے بعد رُوبی نے غار

کا جائزہ لیا۔ غار میں اندھیرا تھا مگر ابھی تک غار کے دروازے میں سے ڈوبتے سورج کے بعد کی گلابی روشنی اندر آ رہی تھی۔ رُوبی کے مُنہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ شام کی روشنی رات کے اندھیرے میں بدلتی گئی۔ پھر رات کا اندھیرا چھا گیا۔ جنگل میں خاموشی طاری ہو گئی۔ غار سے عجیب سی بُو آ رہی تھی۔ روبی خدا کو یاد کر رہی تھی۔ اُس کے دل کو یقین تھا کہ چونکہ وہ نیکی اور سچائی کے راستے پر ہے اس لیے خدا اس کی مدد ضرور کرے گا۔ اس نے گردن کو ہلا ہلا کر اپنے مُنہ پر سے کپڑا کھسکا لیا۔ اب وہ چیخ مار کر کسی کو مدد کے لیے پکار سکتی تھی۔ مگر اُسے معلوم تھا کہ جنگل ویران ہے۔ وہ چاہے جتنا چلائے وہاں کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔ اب اس نے اپنے ہاتھوں کی رسّی کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ مگر رسّی بڑی مضبُوطی سے بندھی تھی۔ رُوبی اسے کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

اتنے میں اسے جنگل میں شیرنی کی دھاڑ سُنائی دی۔ رُوبی کا دل کانپ اُٹھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا سے دُعائیں مانگنے لگی۔ شیرنی کی دھاڑ دوسری بار بلند ہوئی۔ اب وہ غار کے قریب آ گئی تھی۔ اس کے

بعد جنگل میں موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔ رُوبی سمجھ گئی کہ شیرنی نے اس کی بُو پالی ہے اور اب وہ اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ رُوبی نے ایک بار پھر اپنی رسّیاں کھولنے کی کوشش کی کہ وہ یہاں سے بھاگ کر جان بچائے مگر اس کے پاؤں میں بھی رسی بندھی تھی۔ وہ پتھر سے رسی نہ چھُڑا سکی اور اپنے ہاتھوں کی رسی بھی نہ کھول سکی۔

اب اُسے غار سے باہر شیرنی کی غراہٹ سُنائی دی۔ آدم خور شیرنی غار کے باہر کھڑی تھی۔ روبی نے دل میں تین بار کلمہ شریف پڑھا اور غار کے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ اس روشنی میں رُوبی نے ایک بہت بڑی شیرنی کو غار میں داخل ہوتے دیکھا۔ رُوبی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اُس کی موت اس کے قریب آرہی تھی۔ اب خُدا ہی اِسے بچا سکتا تھا۔

شیرنی کے حلق سے غرّاہٹ کی ہلکی ہلکی آواز نکل رہی تھی۔ یہ آواز رُوبی کے قریب آکر بند ہو گئی۔ رُوبی کو شیرنی کے جسم سے نکلنے والی نامانوس سی بُو اپنے بالکل قریب محسوس ہونے لگی۔ پھر اُسے شیرنی کا جسم اپنے بالکل قریب محسوس ہوا۔ اُسے شیرنی کے ہانپنے اور تیز

تیز سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر اُسے غار کے اندھیرے میں انگاروں کی طرح دو سُرخ آنکھیں اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی نظر آئیں۔ یہ شیرنی کی آنکھیں تھیں۔ رُوبی اپنی جگہ پر خوف اور دہشت سے سمٹی آدم خور شیرنی کو تک رہی تھی۔ مگر وہ شیرنی کی لال انگارہ کسی آنکھوں کی تاب نہ لا سکی۔

رُوبی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شیرنی نے رُوبی کے گرد ایک چکر لگایا۔ اِسے شیرنی کا مُنہ اپنے سَر کے قریب لگا۔ شیرنی اُسے سُونگھ رہی تھی۔ رُوبی کا دل جیسے بند ہو گیا تھا۔ اُس کا سانس بھی جیسے رُک گیا تھا۔ شیرنی کسی بھی وقت اُس کی گردن کو اپنے مُنہ میں دبوچ کر اس کے جسم کو چیر پھاڑ سکتی تھی۔

رُوبی اب بھی خدا کو یاد کر رہی تھی اور دل میں کلمہ شریف کا وِرد کر رہی تھی۔ پھر اسے یُوں محسوس ہوا جیسے شیرنی اُس کے پیچھے آ گئی ہے اور اپنا مُنہ اُس کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر بار بار مار رہی ہے۔ رُوبی کو پہلے تو کچھ پتہ نہ چل سکا کہ آدم خور شیرنی اُس کے ہاتھوں پر مُنہ کیوں مار رہی ہے۔ وہ یہ سمجھی کہ شیرنی اُسے ہاتھوں سے کھانا شروع کرے گی۔ مگر بہت

جلد اُسے معلوم ہوگیا کہ شیرنی اس کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسی کو دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کر رہی ہے۔

یہ ایک عجیب بات تھی۔ رُوبی کو اس کا کبھی یقین نہیں آسکتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدم خور شیرنی کی خوراک زندہ اِنسان اس کے سامنے موجود ہو اور وہ اُسے کھانے کی بجائے، اُسے ہڑپ کرنے کی بجائے اس کے ہاتھوں پر بندھی رسی کو کاٹنے کی کوشش کر رہی ہو۔

رُوبی کو فوراً اپنے خدا کا خیال آگیا۔ یہ سب خدا کی مہربانی اور اُس کے کرم سے ہو رہا تھا۔ خدا نے ہی اس آدم خور شیرنی کے دل میں یہ خیال ڈال دیا تھا کہ اس لڑکی کو کھانا مت بلکہ اِس کی رسّی کاٹ کر اِسے آزاد کر دو۔

آدم خور شیرنی نے دانتوں سے رسّی کاٹ ڈالی۔ روبی کے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ اُس نے اندھیرے میں آدم خور شیرنی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ شیرنی کافی بڑی تھی۔ وہ اب رُوبی کے پاؤں کی رسّی کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ رسی رُوبی کے پاؤں میں سے ہو کر ایک بھاری پتھر کے ساتھ بندھی

ہوئی تھی۔ آدم خور شیرنی بڑے آرام سے رسّی کاٹنے میں مصروف تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں شیرنی نے رُوبی کے پاؤں کی رسّی بھی کاٹ دی۔ اب رُوبی آزاد تھی۔ شیرنی اس کی طرف لال لال آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ رُوبی نے سوچا کہ اُسے ایک دم سے باہر بھاگ جانا چاہیے۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ شیرنی نے رُوبی کے پاؤں کو بڑی محبت سے اپنی زبان کے ساتھ دو تین بار چاٹا۔ یہ شیرنی کی طرف سے محبت کا اظہار تھا۔ رُوبی کے پاؤں جیسے کسی نے اپنی محبّت میں جکڑ لیے۔ اس کے دل میں بھی آدم خور شیرنی کے لیے محبت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ رُوبی نے ڈرتے ڈرتے شیرنی کے بالوں بھرے جسم پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کا ساتھ شیرنی کے جسم پر پڑا تو شیرنی نے بھی پلٹ کر اندھیرے میں رُوبی کی طرف دیکھا۔ پھر شیرنی نے رُوبی کے ہاتھ پر پیار سے اپنی زبان پھیری۔ شیرنی کی زبان بہت زیادہ کھُردری تھی۔ رُوبی نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچنا چاہا مگر شیرنی کی شفقت اور محبت نے رُوبی کو ایسا نہ کرنے دیا۔ اور اس نے اپنا ہاتھ شیرنی کے آگے ہی رہنے دیا۔

کچھ دیر شیرنی بڑی محبت سے رُوبی کے ہاتھ پر اپنی زبان پھیرتی رہی۔ پھر وہ رُوبی کے پاؤں کے قریب بیٹھ گئی۔ سانس لینے سے شیرنی کا جسم آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ روبی کو شیرنی کے سانس لینے کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔

جنگل کی سُنسان خاموش رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ آدم خور شیرنی رُوبی کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ پھر اُس نے اپنا بھاری سر زمین کے ساتھ لگا دیا۔ رُوبی شیرنی کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ شیرنی کو رُوبی کی محبت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دھیمے دھیمے غرّا رہی تھی۔ یہ غرّاہٹ غصے کی نہیں محبت کی تھی جو ایک ماں کو اپنی بیٹی سے ہوتی ہے۔

رُوبی دل میں خدا تعالیٰ کے اِس کرشمے پر اس کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہی تھی۔ اگر خدا اس کی مدد نہ کرتا، خدا شیرنی کے دل میں اس کے لیے محبت و شفقت نہ ڈالتا تو وہ زندہ نہیں بچ سکتی تھی۔ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے رُوبی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر اُسے اپنے پیارے بھائی علی کا بھی خیال آگیا

کہ نہ جانے وہ اُس کے حال سے بے خبر خود کہاں ہوگا۔ کس حال میں ہوگا۔ پھر اُسے اپنے ڈیڈی کی لاش یاد آنے لگی۔ رُوبی سِسکیاں بھر کر رونے لگی۔ اس کی سِسکیوں کی آواز پر شیرنی نے سَر اٹھا کر اندھیرے میں رُوبی کی طرف دیکھا اور پیار سے اس کے پاؤں پر اپنی زبان پھیرنی شروع کر دی۔ رُوبی کو یوں لگا جیسے اسے اُس کی ماں دِلاسہ دے رہی ہے۔ اس کا غم آدھا ہو گیا۔ اُس نے شیرنی کی گردن پر ہاتھ رکھا اور پھر اس کی گردن سے لپٹ کر رونے لگی۔

اِس طرح نہ جانے رات کے کس حصّے میں رُوبی کو نیند آ گئی اور وہ سو گئی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس وقت غار میں دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ رُوبی نے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا کہ غار میں شیرنی نہیں تھی۔ پہلے تو روبی کو یُوں محسوس ہوا جیسے اس نے شیرنی کا خواب دیکھا ہو۔ جیسے خواب میں کوئی شیرنی اُس کے پاس آئی ہو۔ لیکن غار کی زمین پر شیرنی کے پنجوں کے نشان پڑے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ رُوبی کو بھی سب کچھ یاد آگیا کہ کانتی اور پرکاش دونوں غنڈے اِسے آدم خور شیرنی کی

غار میں پھینک گئے تھے تاکہ شیرنی اِسے ہڑپ کر جائے۔ لیکن شیرنی نے اُسے ہڑپ کرنے کے بجائے اُس کے ہاتھ پاؤں کی رسّیاں کھول دی تھیں اور اُس کے ساتھ محبّت بھرا سلوک کیا تھا۔

لیکن شیرنی غار میں سے کہاں چلی گئی! رُوبی جلدی سے غار سے باہر نکل آئی۔ غار کے باہر ایک گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اونچے اونچے درختوں پر پرندے صبح کی بولیاں بول رہے تھے۔ غار کے قریب ہی ایک قدرتی چشمہ بہہ رہا تھا۔ رُوبی نے چشمے پر جاکر منہ ہاتھ دھویا اور واپس غار کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

وہ اَب وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی کیونکہ اُسے خطرہ تھا کہ دونوں بدمعاش کانتی اور پرکاش رُوبی کی آدھ کھائی لاش دیکھنے دن کے کسی وقت غار میں آئیں گے تاکہ ان کی تسلّی ہو جائے کہ رُوبی کو شیرنی نے ہلاک کر دیا ہے۔ اگر وہ آگئے اور انھوں نے رُوبی کو زندہ دیکھا تو وہ ضرور اُسے گولی مار دیں گے۔

رُوبی کو اِس جنگل کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کس طرف کو جائے۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ شیرنی چلی گئی ہے اور شاید اب واپس نہیں آئے گی۔

رُوبی کو یہاں بے ہوش کر کے لایا گیا تھا۔ سانپوں والی کوٹھڑی میں بند اس نے دونوں غنڈوں کانتی اور پرکاش کی باتوں سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ جنگل ہندوستان کے گوالیار نام کے شہر کے قریب واقع ہے۔ رُوبی نے سوچا کہ اسے کسی طرح جنگل سے نکل کر گوالیار شہر پہنچ جانا چاہیے۔ وہاں وہ کسی مسلمان گھرانے میں جا کر ان سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں کے دل میں رحم آجائے اور وہ اُسے کسی ترکیب سے واپس پاکستان پہنچا دیں۔ رُوبی کو یہ بالکل معلوم نہ تھا کہ اس کا بھائی علی بھی اس کی تلاش میں بارڈر کراس کر کے ہندوستان پہنچ چکا ہے اور دِلی کی جامع مسجد کے پاس ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے اور اِسے تلاش کرتا پھرتا ہے۔

رُوبی نے غار کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر نیچے جنگل کے درختوں کی طرف غور سے دیکھا۔ وہاں درختوں کے درمیان ایک پگڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ رُوبی نے سوچا کہ وہ اس پگڈنڈی پر چلتی ہوئی شاید کسی قصبے یا گوالیار شہر میں پہنچ جائے۔ وہ چلنے ہی لگی تھی کہ اُسے شیرنی دکھائی دی۔

شیرنی جھاڑیوں کے درمیان سے ہوکر غار کی طرف
چلی آرہی تھی۔ وہ تیز تیز چلی آرہی تھی اور جھاڑیوں کو
پھلانگ کر پار کر رہی تھی۔ اچانک روبی نے دیکھا
کہ شیرنی نے اپنے دانتوں میں درخت کی ایک ٹہنی پکڑ
رکھی ہے۔ دُور سے رُوبی کچھ اندازہ نہ لگاسکی۔ جب
شیرنی ذرا قریب آئی تو روبی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ
شیرنی نے اپنے دانتوں میں کیلوں کا ایک گچھا دبا
رکھا تھا۔ شیرنی غار کے پاس آکر رُک گئی۔ اُس نے
کیلوں کا گچھا رُوبی کے قدموں کے پاس رکھ دیا اور
خود بڑی محبت سے رُوبی کا مُنھ تکنے لگی۔ شیرنی بار
بار غرا رہی تھی جیسے اُسے کہہ رہی ہو۔

"میری بیٹی! میں تمہارے لیے جنگل سے کیلے لائی
ہوں۔ اِسے کھالو۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی"۔

رُوبی شیرنی کی اِس ماتا اور محبت سے بہت
متأثر ہوئی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ وہ بیٹھ گئی۔
اُس نے شیرنی کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ دن
کی روشنی میں اِسے شیرنی سے کچھ کچھ خوف بھی محسوس
ہو رہا تھا۔ مگر شیرنی کی محبت اور ماتا بھری شفقت
نے اس خوف کو بہت جلد رُوبی کے دل سے نکال

دیا۔ شیرنی بڑی طاقت ور اور اونچی لمبی تھی۔ اُس کا چہرہ پُر جلال اور بھرا بھرا تھا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ مگر رُوبی کے لیے اِن میں پیار اور محبت کی جھلک تھی۔

رُوبی نے ایک کیلا چھیل کر کھایا۔ یہ بسنتی رنگ کا جنگلی کیلا تھا اور بڑا میٹھا تھا۔ روبی نے جی بھر کر کیلے کھائے۔ جب اس کی بھوک مِٹ گئی تو پانی پینے کے لیے چشمے کی طرف گئی۔ شیرنی اس کے ساتھ ساتھ تھی جیسے اس کی حفاظت کر رہی ہو۔ روبی کو محسوس ہوا کہ ایک زبردست طاقت اس کی حفاظت کرنے لگی ہے۔ یہ طاقت، یہ حفاظت اللہ ہی کی طرف سے رُوبی کو عطا ہوئی تھی۔

رُوبی نے چشمے پر سے پانی پیا اور شیرنی کی طرف اَلوداعی نظروں سے دیکھا۔ اب وہ وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کا دل شیرنی سے بچھڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔ شیرنی کو شاید پتہ چل گیا تھا کہ روبی اُسے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ شیرنی روبی کے اِردگرد چکر لگانے اور بڑے پیار سے اپنا سَر اس کے جسم سے رگڑنے لگی۔ روبی کا دل شیرنی کے لیے اُداس ہونے لگا مگر

اُسے وہاں سے جانا ہی تھا۔ وہ شیرنی کے پاس کیسے رہ سکتی تھی۔ اُسے واپس پاکستان اپنے بھائی کے پاس پہنچنا تھا۔

رُوبی وہاں سے چلنے ہی لگی تھی کہ اُسے آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سُنائی دی۔ روبی وہیں غار کے مُنھ کے پاس بیٹھ گئی۔ اُسے شبہ تھا کہ کانتی اور پرکاش روبی کی لاش دیکھنے آئے ہوں گے۔ شیرنی کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ غصے سے بار بار دُم کو ہلا رہی تھی اُس کے حلق سے غصیلی غراہٹ کی آواز نکلنے لگی تھی۔

رُوبی نے دیکھا کہ دو آدمی درختوں میں سے نکل کر غار کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔ روبی نے انہیں دن کی روشنی میں صاف پہچان لیا۔ اِن میں سے ایک کانتی بدمعاش اور دوسرا جنگل والے اڈے کا پہرے دار پرکاش تھا۔ کانتی پیچھے تھا اور پرکاش آگے آگے۔ دونوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

شیرنی نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ شیرنی کے جسم سے بجلیاں سی نکلنے لگیں۔ شیرنی نے اپنا بھاری چہرہ زمین کے ساتھ لگا دیا۔ پھر اتنی زور سے اُچھل کر چھلانگ لگائی کہ رُوبی کے دیکھتے ہی دیکھتے

شیرنی جھاڑیوں پر سے اُچھلتی ہوئی اپنے آگے آنے والے بدمعاش پرکاش کے سر پر پہنچ گئی۔ وہ اچھل کر پرکاش کے اُوپر گری اور اُسے بندوق چلانے کا موقع ہی نہ دیا۔ شیرنی کے حلق سے دہشت ناک گرج بلند ہوئی اور اس نے دیکھتے دیکھتے پرکاش غنڈے کی گردن کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ دوسرا بدمعاش کانتی خوف کے مارے وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر درختوں میں بھاگ گیا۔ شیرنی نے پرکاش غنڈے کی لاش اپنے منھ میں دبوچی اور اسے لے کر روبی کے پاس آ گئی۔ پرکاش کی گردن کا گوشت لوتھڑوں کی شکل میں لٹک رہا تھا۔ اس کی گردن ڈھلک گئی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ شیرنی نے لاش کو غار کے ایک طرف ڈال دیا اور خود رُوبی کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئی۔ شیرنی نے رُوبی کی جان بچالی تھی۔ اگر وہ نہ ہوتی تو پرکاش اور کانتی رُوبی کو زندہ حالت میں دیکھ کر فوراً گولی مار کر ہلاک کر دیتے۔

رُوبی نے سوچا کہ اب اس کے لیے جنگل سے اکیلے نکلنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ کانتی بدمعاش جنگل میں موجود ہے۔ اگر وہ گئی تو کانتی بدمعاش کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔ اس نے سوچا کہ ابھی اُسے شیرنی کی حفاظت

میں اِس غار میں ہی رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ کانتی بدمعاش دوبارہ غار میں اس کی لاش دیکھنے آئے اور شیرنی اُسے بھی ہلاک کر دے۔ اس کے بعد رُوبی کے لیے میدان صاف ہو جائے گا اور وہ بڑی بے فکر ہو کر جنگل میں سفر کرتی ہوئی گوالیار شہر پہنچ سکے گی۔

رُوبی غار کے اندر آ گئی۔ شیرنی بھی اُس کے ساتھ ہی غار میں آ گئی۔ تھوڑی دیر وہ روبی کے پاس بیٹھی رہی۔ پھر غار کے باہر آ کر شیرنی نے جنگل میں ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ زور سے دھاڑی۔ اس کی دھاڑ سے سارا جنگل گونج اُٹھا۔ اس کے ساتھ ہی جنگل میں سے بندوق کے فائر کا دھماکہ بلند ہوا۔ رُوبی چونک پڑی۔ اس فائر کا مطلب یہ تھا کہ کانتی بدمعاش وہیں قریب ہی تھا اور بہت ممکن تھا کہ اُس نے روبی کو شیرنی کے پاس زندہ حالت میں کھڑے دیکھ لیا تھا اور اب وہ ہر حالت میں روبی اور شیرنی دونوں کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔

رُوبی نے کانتی کی بندوق کی آواز سُن کر فیصلہ کر لیا کہ وہ ابھی غار کے اندر ہی رہے گی اور جنگل میں نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔ شیرنی ابھی تک باہر ہی تھی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی شیرنی زور زور سے دھاڑنے

لگی جیسے وہ کانتی کو کہہ رہی ہو کہ اگر غار کی طرف آئے تو چیر پھاڑ کر رکھ دوں گی۔ رُوبی کو یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ کانتی کے پاس بندوق ہے۔ کہیں وہ گولی چلا کر شیرنی کو ہلاک نہ کر ڈالے۔ اگر شیرنی مر گئی تو پھر روبی کو بھی وہ بدمعاش آسانی سے ہلاک کر ڈالے گا۔

رُوبی غار میں چُپ چاپ بیٹھی اپنے خیالوں میں گُم تھی اُس کے سامنے کیلوں کا گھاٹرا تھا۔ اس کی بُھوک مٹانے کے لیے گچھے کے ساتھ بے شمار میٹھے کیلے لگے ہوئے تھے۔ وہ سارا دن غار میں گزار سکتی تھی۔ غار کے باہر شیرنی کچھ دیر تک دھاڑتی رہی۔ اس کے بعد جنگل سے فائر کی کوئی آواز نہ آئی۔

رُوبی سمجھ گئی کہ کانتی بدمعاش اب گھات لگا کر حملہ کرے گا۔ وہ چھُپ کر آئے گا اور سب سے پہلے شیرنی کو گولی مارے گا اور اس کے بعد غار میں گھُس کر رُوبی کو بھی گولی سے اُڑا دے گا۔ کانتی بدمعاش کو معلوم تھا کہ رُوبی غار میں چھُپی ہوئی ہے اور آدم خور شیرنی اُسے کھانے کی بجائے اس کی حفاظت کر رہی ہے۔

شیرنی کچھ دیر تک باہر دھاڑنے کے بعد غار میں آ کر رُوبی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ پر کاش غنڈے کی

لاش غار کے باہر پڑی تھی۔

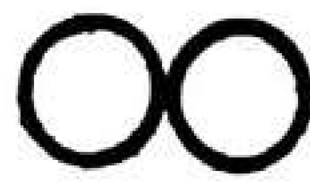
شیرنی کانپ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ابھی تک غصے کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ شیرنی نے اپنا سر روبی کے پاؤں کے ساتھ لگا دیا اور اس کے پاؤں پر اپنی زبان پھیرنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو، تم کیوں فکر کرتی ہو بیٹی! جب تک میں زندہ ہوں تمہاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔

دن گزرتا چلا گیا۔ دوپہر کو رُوبی کو بھوک لگی تو اُس نے کیلے کھا کر بھوک مٹائی۔ اب اُسے پیاس لگی۔ وہ اُٹھ کر غار کے باہر گئی۔ شیرنی چوکنی ہو کر اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ چشمہ غار کے قریب ہی تھا۔ روبی نے جلدی جلدی پانی پیا اور تیز تیز چلتی غار میں واپس آ گئی۔

پھر شام ہو گئی اور اُس کے بعد جنگل میں اندھیرا اور گہری خاموشی چھا گئی۔ شیرنی ایک پل کے لیے بھی رُوبی کو اکیلی چھوڑ کر باہر نہ گئی تھی۔ رات گزرنے لگی۔ پھر جنگل پر موت ایسا سناٹا طاری ہو گیا۔ شیرنی روبی کے پاؤں میں سر رکھے آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔ اچانک اُس نے اپنے کان کھڑے کر لیے۔ سر اُوپر اٹھا کر غار کے

دروازے کی طرف دیکھا جیسے اس نے کسی آدمی کی بُو سونگھ
لی ہو۔ پھر غرّاتے ہوئے بڑی تیزی سے غار سے باہر نکل
گئی۔ رُوبی غار میں اکیلی رہ گئی۔ اُسے ڈر سا محسوس ہونے
لگا۔ شیرنی کی غرّاہٹ کی آواز آہستہ آہستہ جنگل میں دُور
ہوتے غائب ہو گئی۔ رُوبی کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔
اُس نے سوچا کہ اُسے بھی غار سے نکل کر جنگل میں کسی
دوسری جگہ چھُپ جانا چاہیے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی
تھی کہ اُسے اِنسانی قدموں کی آواز سُنائی دی۔ یہ آواز
غار کی طرف بڑھ رہی تھی۔

رُوبی نے اپنا سانس روک لیا۔



مطبُوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسّلام پرنٹر اور پبلشر

ختم نبوت ﷺ زندہ باد   عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من **اردو بکس** آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

1۔ گروپ میں یا گروپ ایڈ من سے کوئی بھی بات / درخواست / فرمائش کرتے وقت **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ** کو فروغ دیں۔

2۔ ایڈ منز یا دیگر ممبرز جو بھی اچھی پوسٹ کریں اس پر کمنٹس / شکرز / رائے لازمی کریں تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور دیگر ممبران کو بھی اس کتاب / پوسٹ کی اہمیت کا اندازہ ہو۔

3۔ گروپ ایڈ منز سے پرسنل سوالات مت کیجئے۔ صرف کتب کے متعلق دریافت کریں یا درخواست کریں۔

4۔ ایڈ منز اور ممبرز سے اخلاق سے پیش آئیں۔ اگر ہم ادبی گروپ میں موجود ہیں لیکن ہماری اخلاقیات معیاری نہیں تو ہمیں ادبی گروپ کا ممبر کہلانے کا بھی کوئی حق نہیں۔

5 گروپ میں یا ایڈ من کے انباکس میں وائس میسج، ویڈیوز بھیجنے کی حرکت مت کریں ورنہ بلاک کر دیئے جائیں گے۔

6۔ سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

7۔ تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے فری آف کاسٹ وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔

7۔ ہمارا گروپ جوائن کرنے کے لئے درج ذیل لنکس پر کلک کریں اور وٹس ایپ سلیکٹ کر کے جوائن کر لیں۔

1. https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
2. https://chat.whatsapp.com/Koqfq0iOsCm0F88xfiaLQ1
3. https://chat.whatsapp.com/IEl5cejf7Xc0b1HjApSyxI

گروپ فل ہونے کی صورت میں ایڈ من سے وٹس ایپ پر میسج کریں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔

0343-7008883   0333-8033313

اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو

اے حمید کی تازہ ترین



- ہینڈز اپ
- کمانڈو سانپ
- موت کا تہ خانہ
- ٹرین میں قتل
- کمانڈو بوائے کا فرار
- موت کی چھلانگ
- زہریلا بال پوائنٹ
- کمانڈو ایکشن
- کمانڈو موت کے سامنے



فیروز سنز پرائیویٹ، لمیٹڈ

لاہور - راولپنڈی - کراچی

969 0 00965 6

Rs. 15.00